بنتِ حوّا

مائل خیر آبادی

بنتِ حوّا

ماہنامہ ''حجاب'' میں اپنے افسانے ''یوسف زلیخا'' پر مسرور ادیب کی کڑی تنقید پڑھ کر وہ بہت جزبز ہوئی۔ ''جاہل کالٹھ'' اس کی زبان سے نکلا اور اس نے بڑا سا منہ بنا کر رسالہ ایک طرف پھینک دیا۔ لیکن اس طرح اسے تسکین نہیں ہوئی۔ تسکین ہوتی بھی کیسے؟ وہ کوئی جاہل یا گنوار تو تھی نہیں کہ ایک غائب شخص پر غصہ کرکے اپنی جگہ خوش ہولیتی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور غیور خاتون تھی۔ غیور طبیعت کے لوگوں کی فطرت اس بہادر بادشاہ کی طرح ہوتی ہے جو دشمن کو زندہ رکھ کر اسے اپنا مطیع ہمنوا بنالینے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ ایسا انتقام بڑا فتحمندانہ انتقام ہوتا ہے۔ چنانچہ کچھ دیر بعد جب اس کا غصہ کسی قدر کم ہوا تو اس نے فیصلہ کیا کہ مسرور ادیب کو ''جاہل کالٹھ'' کہنے کے بجائے ایسا دنداں شکن جواب دیا جائے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائے۔

یہ سوچ کر اس نے ماہنامہ ''حجاب'' ہی کے لیے ایک جوابی مضمون لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس غرض سے اس نے ''حجاب'' کا وہ شمارہ جسے غصے میں پھینک دیا تھا، اٹھایا اور اپنے افسانے پر مسرور ادیب کی تنقید پھر پڑھنے لگی۔ اس نے قریب قریب نصف مضمون پڑھا ہوگا کہ خیال آیا ''جنگ دورخ دارد'' نہ جانے بات کیا بنے؟ لیکن اس اندیشے کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی، اسے خیال آیا کہ ایک مسرور کی مخالفت سے ہوتا کیا ہے؟ حلقۂ نشاط کے گیارہ ادیبوں نے تو میرے افسانے کو اس سال کا عظیم افسانہ قرار دیا ہے۔

وہ غور سے پڑھتی رہی۔ دوسری بار پڑھ کر تیسری بار پڑھنا شروع کیا۔ اب کی بار اس تنقیدی مضمون کے جن حصوں پر اسے گرفت کرنی تھی، پینسل سے ان پر نشان لگاتی گئی۔ اس کے بعد اس نے کچھ اشارات قلم بند کیے۔ پھر سنبھل کر بیٹھی اور چاہا کہ جوابی مضمون لکھنا شروع کردے۔ معاً اسے خیال آیا کہ یہ اس کے لیے مناسب نہیں، ہوسکتا ہے کہ اس طرح اپنے منھ میاں مٹھو بننے کی پھبتی اس پر چسپاں ہوجائے۔ اس نے قلم روک لیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ پھر اس کے دل کو تسکین کیسے ہو؟ وہ دیر تک سوچتی رہی۔ آخر اس نے طے کیا کہ جوابی مضمون لکھنا حلقۂ نشاط کے ادیبوں پر چھوڑا جائے۔ اس حلقے میں میرے افسانے سے جو فضا بنی ہے اس کے تحت ''ارباب نشاط'' خود مسؔرور کی کی خبر لیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادھر میں براہ راست خط و کتابت کے ذریعے اسے قائل کرنے کی کوشش کروں ـــــ وہ اس فیصلے پر جم گئی اور اب جوابی مضمون کے بجائے مسؔرور کے نام خط لکھنا شروع کردیا۔ مقام و تاریخ کے بعد اس نے لکھا۔

محترمی مسرور صاحب

آداب وتسلیمات

ماہنامہ ''حجاب'' میں اپنے افسانے ''یوسف زلیخا'' پر آپ کی فاضلانہ لیکن کڑی تنقید نظر سے گزری۔ یقین جانیے، میں نے اسے بڑی دل چسپی سے پڑھا۔ اس سے پہلے بھی مختلف موضوعات پر آپ کے متعدد مضامین میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ میں بطور شکوہ نہیں، حقیقت کے طور پر عرض کرتی ہوں اور میرا محض اپنا تاثر نہیں، کچھ اور لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ مسرور صاحب اپنی جگہ کچھ بھی لکھیں، انھیں پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے قلم نے کہاں کہاں کس کس کو مجروح کیا۔ لیکن جب خود ان کے نظریات پر چوٹ پڑتی ہے تو بلبلا جاتے ہیں۔ پھر جو قلم اٹھاتے ہیں تو کسی کو نہیں بخشتے۔ ایسے موقع پر کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

محترمی! آپ مانیں یا نہ مانیں، میرے خیال میں یہ شعر آپ پر ٹھیک ٹھیک

صادق آتا ہے۔ پھر بھلا مجھ جیسی نو آموز کو آپ خاطر میں کب لانے لگے۔ یہ تو اپنے افسانے پر آپ کی فاضلانہ تنقید پڑھ کر یوں خوش ہولی کہ آپ نے مجھ غریب کو کسی نہ کسی صورت قابل اعتناء تو سمجھا۔

ترچھی نظر سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
میں اس پہ خوش ہوں، ہوں تو کسی کی نگاہ میں

آپ میری اس تمہید کو پڑھ کر مجھے معاف فرمائیں۔ میں نے اپنا مافی الضمیر اس لیے آپ کے سامنے رکھ دیا تاکہ آپ جان لیں۔ میں ایک صاف گو عورت ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ اسی صاف گوئی سے آپ بھی کام لیں گے جب کہ صاف گوئی کے میدان میں خود بخود آپ کی طبیعت میں جولانی اور قلم میں روانی آجاتی ہے۔

اس کے بعد میں اپنے افسانے ''یوسف زلیخا'' کے متعلق یہ ضرور عرض کروں گی کہ آپ نے میرے افسانے کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ ایک طرف وہ گیارہ ادیب ہیں انھوں نے میرے افسانے کی صحت زبان کو، بیان کو، جدت و ندرت اور فکر و نظر کو سراہا اور بیک زبان انھوں نے اس افسانے کو اس سال کا عظیم افسانہ قرار دیا ہے۔ ایک آپ ہیں کہ آپ نے میرے افسانے کی صحت زبان ہی سے انکار کردیا۔ آپ نے میرے افسانے کے طرز بیان کو بچکانہ کہہ ڈالا۔ آپ نے میرے افسانے کی جدت و ندرت کو الّھڑپن سے تعبیر کیا اور غضب بالائے غضب! آپ نے میرے افسانے کو ''لذتیات'' کا شاہکار ثابت کردکھایا۔

جو چاہے آپ کا کلک کرشمہ ساز کرے

میرا خیال ہے کہ اگر آپ ٹھنڈے دل سے اپنی کڑی تنقید کو پھر سے پڑھیں تو شاید اسے ظلم تصور فرمائیں۔ میں نے افسانہ لکھنے سے پہلے معذرتاً اپنی نو آموزی اور کم مائیگی کے متعلق نوٹ بھی لکھ دیا تھا۔ میرا یہ نوٹ تکلف و تصنع نہیں، احوال واقعی تھا پھر بھی میں آپ کی نظر میں رعایت اور حوصلہ افزائی کی مستحق نہ ٹھہری۔

مسرور صاحب! جس طرح قلم آپ کی انگلیوں کے اشارے پر گردش کرنے لگتا

ہے، اسی طرح دوسروں کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی قلم پکڑنا جانتی ہیں اور اسے بہر طور جنبش میں بھی لاسکتی ہیں لیکن میں اس ''بہر طور'' کو پسند نہیں کرتی ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ براہ راست مجھ سے تبادلہ خیال فرما کر حق کو حق اور ناحق کو ناحق تسلیم کریں؟

اگر اس غریب کی یہ معروضات آپ پسند فرمائیں، اور کاش کہ آپ پسند فرمائیں تو پھر آپ مجھے بتائیں کہ میرے افسانے میں زبان کے اعتبار سے کون کون فقرے صحت سے گرے ہوئے ہیں؟ یہ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ آپ تنقید کرتے وقت افسانے کی زبان کو بچکانہ کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ ثبوت میں کوئی فقرہ یا لفظ نقل نہیں فرمایا۔ آپ نے تو سارا زور میری فکر ونظر کی مقصدیت وغیر مقصدیت پر صرف فرمادیا ہے اور وہ آپ کی مقصدیت اور غیر مقصدیت کے گرد گھوم رہی ہے کہ:-

''حضرت یوسفؑ کھلی ہوا میں پرورش پانے کی وجہ سے اور متناسب الاعضاء ہونے کی بنا پر خوب صورت، توانا اور تندرست تو تھے لیکن ان کا رنگ چٹا نہیں تھا۔''

میرے اس دعوے کو آپ بے دلیل فرماتے ہیں حالانکہ میں نے اپنے افسانے میں صاف صاف کہا کہ عام طور پر چرواہے اور دن رات دھوپ میں کام کرنے والے اور گرم جگہوں کے رہنے والے سیاہ رنگ کے ہوتے یا ہوجاتے ہیں۔ آپ فرمائیں کیا یہ غلط ہے؟

دیکھیے، یہ میں آپ سے عرض کردوں کہ میں نے اردو اور عربی زبانوں میں ایم اے کیا ہے اور اب اردو میں ریسرچ کا ارادہ کررہی ہوں۔ چوں کہ مجھے علم وادب سے دل چسپی ہے اس لیے میں نے بطور معاش نہیں، بطور دل چسپی اسلامیہ کالج میں ہائی کلاسز کو اردو پڑھانے کے لیے آنریری ملازمت کرلی ہے۔ اگر آپ میرے خط کا جواب دینا پسند کریں تو کالج ہی کے پتے پر لکھیں۔ میں چاہتی تو ماہنامہ ''نشاط'' کے ذریعے آپ کی تنقید کا جواب دیتی ۔ مگر میں نے وہ راہ اختیار نہیں کی۔ آپ سے براہ راست تبادلۂ خیال مناسب سمجھا۔ امید ہے کہ آپ بھی پسند فرمائیں گے میں آپ کے نوازش نامہ کی منتظر رہوں گی۔

والتسلیم

مظلوم مخفی

خط لکھ کر اس نے ایک نظر اس پر پھر ڈالی۔ اس کے بعد اپنا خوبصورت پیڈ اٹھایا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ خط صاف کرکے لفافے میں بند کیا اور ماہنامہ ''حجاب'' کے پتے پر مکتوب الیہ کو روانہ کردیا۔

یہ خط ایک نہایت حسین گلابی لفافے میں مسرور کو ملا۔ وہ بے خیالی میں لفافے پر چھپے ہوئے اس خوبصورت پھول کو دیکھنے لگا جس کے اندر ''مخفی ایم۔اے'' کا ابھرا ہوا نقش بنا تھا۔ اس نے لفافے کو کھولا، خط نکالا، پڑھا اور جیب میں رکھ لیا۔ عصر کے بعد دارالمطالعہ گیا، جہاں وہ ماہ بماہ اپنے نام آئے ہوئے سارے رسالے پابندی سے دے دیا کرتا تھا۔ اس نے ناظم دارلمطالعہ سے ''حجاب'' کا تازہ پرچہ جس میں افسانہ ''یوسف زلیخا'' پر اس کی تنقید شائع ہوئی تھی، اپنے نام جاری کرایا اور چلا آیا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا ــــ کھانا کھا کر، اپنے کمرے میں جا بیٹھا ــــ پہلے ''حجاب'' میں اپنی تنقید پڑھی۔ پھر جیب سے مخفی کا خط نکالا۔ ایک نظر پھر اس پر ڈالی اور ساتھ ہی جہاں اس نے مناسب سمجھا، پنسل سے نشان کرتا رہا۔ اس کے بعد بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں عشاء کی نماز ہوئی۔ اذان سن کر اٹھا۔ وضو کیا اور مسجد چلا گیا۔ مسجد سے واپس آکر اس نے ماہنامہ ''حجاب'' اور مخفی کے خط کو سامنے رکھا اور جواب لکھنے لگا۔ اس میں اسے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ چاہتا تھا کہ رات ہی میں خط صاف کر ڈالے کہ دوسرے کمرے سے آواز آئی ــــ ''مسرور! ابھی سوئے نہیں تم!'' یہ آواز سن کر اس نے قلم رکھ دیا۔ صبح کو اپنے جواب پر نظر ثانی کی۔ اس کے بعد نقل کرکے لفافے میں بند کیا۔ پتہ لکھا اور خود جاکر لیٹر بکس میں ڈال آیا۔

وہاں مخفی اس کے خط کا بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کررہی تھی۔ اسے بڑی خوشی ہوئی جب مسرور ادیب کا ''نوازش نامہ'' اسے ملا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافے سے خط نکالا اور پڑھنا شروع کردیا۔

محترمہ بہن!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ''افسانہ ٔ یوسف زلیخا'' پر میری تنقید آپ سے مراسلت کی راہ کھول دے گی۔ میں نے تو اپنا فرض سمجھ کر ایک کام انجام دے دیا تھا۔

اس کے بعد کبھی خیال آیا بھی تو یہ کہ ''نشاط'' کے اگلے شمارے میں شاید اس کا کوئی جواب شائع ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ رسالوں میں ردّ وقدح شروع ہونے سے پہلے آپ نے محض اپنی فراخ دلی سے ایسی راہ نکالی کہ اب ہم آپس میں تبادلۂ خیال کرکے کسی تیسرے کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر ایک نتیجے پر پہنچ جائیں گے ـــــ آپ یقین جانیے، اگر مجھے پہلے سے آپ کی وسعت قلبی کا یہ حال اور آپ کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اپنی تنقید پہلے آپ کی خدمت میں بھیجتا۔ میرے تنقیدی مضمون میں جن الفاظ کو آپ اپنے شایان شان نہ سمجھ کر نشان زد کردیتیں انھیں میں نکال دیتا۔ اس کے بعد اشاعت کے لیے دیتا، لیکن اب کیا ہوتا ہے، تیر کمان سے نکل چکا ـــــ اب اگر میں آپ سے معذرت چاہوں تو شاید آپ اسے تکلف سمجھیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ میرے جن فقروں سے آپ کو رنج پہنچا وہ چاہے مبنی برحقیقت ہوں، لیکن میری نظر میں ان کی وقعت گھٹ گئی اور اب مجھے بھی افسوس ہے۔ مجھے ایسے فقروں اور لفظوں پر آپ سے معافی مانگنے میں ذرا بھی عار نہیں۔ اگر آپ مجھے معاف کردیں تو آپ کی فراخ دلی کا یہ دوسرا ثبوت ہوگا اور اخلاقی اعتبار سے میرا دل آپ کی بڑائی کا اعتراف کرے گا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے آپ اجر کی مستحق ہوں گی۔

اس کے بعد جس طرح آپ نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور علمی اسناد سے صاف صاف آگاہ فرمادیا۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی تعلیمی استعداد سے آپ کو واقف کردوں۔ میں نے کسی گورنمنٹ اسکول سے کوئی درجہ پاس نہیں کیا۔ مجھے شُد بُد جو معلوم ہے وہ سب میرے بڑے بھائی مولانا منصور عالم صاحب کا عطیہ اور ان کی محنت وتوجہ کا ثمرہ ہے۔ بھائی صاحب گو خود گریجویٹ ہیں لیکن گورنمنٹ اسکولوں کی تعلیم سے بے حد متنفر۔ وہ ان اسکولوں کو معصوم بچوں کی قتل گاہ کہتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ لیں کہ میں اسناد کے چھوٹے سے چھوٹے پیمانے سے بھی ناپا جاؤں تو بونا ہی ثابت ہوں گا۔ لیکن مجھے اس کا مطلق غم نہیں۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ان قتل گاہوں سے محفوظ رکھا۔

اس تمہید کے بعد اب آپ اپنے سوالات کے جوابات سنیے:

براہِ کرم جیسا کہ آپ نے مجھ سے تقاضا کیا، خود بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے کہ میرا قلم کس مقام پر انصاف سے ہٹ گیا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ ایک طرف گیارہ ادیبوں نے افسانہ یوسف زلیخا کو اس سال کا عظیم افسانہ قرار دیا اور دوسری طرف ایک شخص صرف اپنی رائے میں منفرد ہے اور ان گیارہ کے برعکس رائے رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ اگر بیشتر لوگ صحیح کو غلط اور باطل کو حق سمجھنے لگیں تو کیا آپ ان کی بات مان لیں گی؟ انسانوں کی ایک کثیر تعداد مدتوں زہر ہلاہل کو تریاق کہتی رہے تو کیا واقعی زہر ہلاہل تریاق ہی ہوجائے گا؟ آپ کے وہ گیارہ کیا، ان سے زیادہ قابل گیارہ ہزار ادیب کانٹوں کو پھول قرار دے دیں تو کیا آپ کانٹوں کو ہار بنا کر پہن لیں گی اور ایسے ہار کی مہک آپ کے دماغ کو تازگی بخشے گی؟ کوئی معقول آدمی اس نامعقولیت کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ آپ مجھے انتہائی گستاخ تصور فرمائیں گی ورنہ میں بتاتا کہ ان گیارہ ادیبوں نے آپ کے افسانے کو اتنا اچھالنے کی کوشش کیوں کی؟ —— انھوں نے آپ کے افسانے کی زبان کو سراہا۔ اس سے آپ خوش ہولیں تو ہولیں لیکن زبان داں حضرات جانتے ہیں کہ ''ارباب نشاط'' نے آپ کے افسانے کے آئینے میں آپ کو دیکھ لیا ہے اور اب وہ تالیاں بجا بجا کر آپ کا مذاق اڑا رہے ہیں جسے آپ اپنی ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی بنا پر مدح وستائش سمجھ بیٹھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ''آپ نے زبان کے اعتبار سے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے مگر انھیں تو ایک کھلونا چاہیے۔ بعض اوقات مجھے پڑھی لکھی خواتین پر افسوس بلکہ غصہ آتا ہے'' —— کہ وہ جاہل عورتوں سے زیادہ آسانی کے ساتھ مردوں کے دام فریب میں پھنس جاتی ہیں۔ میں آپ کے افسانے کی زبان کی کچھ غلطیوں کی نشان دہی کرتا ہوں۔ انھیں سے آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کے افسانے کا ایک غلط فقرہ آپ نے اپنے اس خط میں بھی دہرایا ہے۔ ذرا آپ اپنے اس فقرے پر غور فرمائیں —— ''دن رات دھوپ میں کام کرنے والے عام طور پر سیاہ ہوتے جاتے ہیں'' —— اردو میں دن رات کام کرنا انتہائی محنت کے اظہار کے وقت بولا جاتا ہے لیکن یہ دن رات دھوپ میں کام کرنا چہ معنی دارد؟ دن کو تو دھوپ بچشم سر —— میں نے کیا، سب نے دیکھی ہے مگر رات میں دھوپ؟ یہ آپ کا کون

سا مشاہدہ ہے اور یہ کیسی زبان ہے؟ اردو میں کیا کسی زبان میں اس کی مثال نہ ملے گی۔

اس کے بعد آپ اپنی دوسری معرکہ آرا غلطی ملاحظہ فرمائیے ——— مزے کی بات یہ ہے کہ اس غلطی میں آپ اکیلی نہیں ہیں۔ بڑے بڑے آپ کے شریک ہیں۔ آپ نے اپنے افسانے میں غریب الوطن یوسف کی زبان سے فارسی کی ایک رباعی کے دو مصرعے پڑھوائے ہیں:

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر   خارِ وطن از سنبل وریحاں خوشتر

آپ اپنے کو اردو اور عربی میں ایم اے بتاتی ہیں اور اب ریسرچ کا ارادہ کر رہی ہیں لیکن اس شعر کے دوسرے مصرع کی جیسی مٹی پلید ہوتی چلی آئی ہے، آپ نے بھی اس پر غور نہیں فرمایا اور اپنے پیش روؤں کی طرح نقل فرما گئیں۔ پہلے مصرع کے خار اور سنبل و ریحاں کی لفظی نسبت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع میں ''سنبل و ریحاں'' کے مقابلے میں ''خار'' ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں ''ملک[1]'' کے مقابلے میں قریہ، گاؤں، جھونپڑا، پہاڑ کی کھوہ یا کوئی اندھا کنواں ہونا چاہیے۔ یا پھر دوسرا مصرع یوں بننا چاہیے تھا کہ وطن کے لوگوں کی دشمنی ملک سلیماں کے لوگوں کی دوستی سے بہتر ہے۔ اگر میری توجیہ صحیح ہے تو پھر دوسرے مصرعے میں ''حب'' کے بدلے دوسرا لفظ تلاش کرنا پڑے گا اور یہ ماننا ہوگا کہ شاعر نے اس لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھا ہوگا لیکن کاتب سے سہو ہوگیا۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اس ''حب'' کی کتابت میں کاتب نے ایسی خوبصورتی اور چابک دستی سے تحریف کی ہے کہ کسی کی نظر آج تک اصل لفظ کی طرف جا ہی نہ سکی۔

محترمہ! آپ نے عربی میں ایم اے کیا ہے۔ پھر آپ نے ''یوسف زلیخا'' افسانہ رقم فرمایا ہے تو سورۂ یوسف بھی آپ کے پیش نظر ضرور رہی ہوگی۔ سورۂ یوسف نے ''غیابة الجُبّ'' دوبار آیا ہے۔ اسے بھی آپ نے پڑھا ہوگا اور یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ''جُبّ'' کے معنی کنوئیں کے ہیں تو پھر دوسرے مصرع کا اصل لفظ آپ کیوں نہ

---

(۱) فارسی زبان کے معنوں میں۔

پاسکیں اور کورانہ تقلید میں ''جبّ وطن'' کو ''حب وطن'' آپ نے بھی رقم فرمادیا۔ کاتبوں کی ''نقطہ نوازی'' سے ایک نقطے کا اڑ جانا کیا بڑی بات ہے۔ مگر واہ ری اندھی تقلید جو لفظ چل پڑا بس چل پڑا۔

''جُبّ'' اور حُبّ'' کی وضاحت کے بعد اب اگر مجھ جیسا کوئی کم علم بڑھ کر ٹوک دے تو آپ سے کچھ اور تو نہ ہو سکے گا۔ بس یہ شعر پڑھ پڑھ کر طنز کریں گی کہ ؂

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس کے علاوہ حضرت یوسفؑ کی زبان سے ''ملک سلیمان'' کا تذکرہ یوں بھی واقعہ کے خلاف ہے۔ آں جناب کا زمانہ تو حضرت سلیمانؑ سے صدیوں پہلے گزر چکا ہے۔ خیر! میں نے آپ کی دو لسانی غلطیوں کی طرف آپ کو متوجہ کیا۔ آپ کے افسانے میں دوسری غلطیاں اس درجے کی نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہیں کثرت سے، مثلاً۔

- حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں کھل گئیں'' کے بجائے ''آنکھوں میں بینائی آ گئی'' ہونا چاہیے۔''
- بازار مصر میں یوسفؑ کی طرف چاروں طرف سے ''انگلیاں اٹھنے لگیں'' انگلیاں اٹھنے لگیں'' سے ذم کا پہلو نمایاں کیا جاتا ہے۔ ''نظریں اٹھ گئیں'' ہونا چاہیے۔
- یعقوبؑ کے بیٹے غلہ پا کر پکار اٹھے "فجزاہ اللّٰہ الخیر الجزاء "عربی کے فقرے میں مضاف "خیر" پر آپ کے "ال"کی ریسرچ غلط ہے۔
- یہ سن کر خواتین مصر کے مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اس جملے میں مضاف اور مضاف الیہ میں فصل برا معلوم ہوتا ہے ''خواتین مصر کے پیٹ میں بل پڑ گئے'' لکھنا چاہیے۔
- حضرت یوسفؑ کے جیل خانے میں دو قیدیوں سے خاص طور پر تعلقات تھے۔'' اس جملے میں بھی وہی غلطی ہے۔ لفظ ''تعلقات'' ''یوسف'' کے'' پاس ہی ہونا چاہیے۔''

اس ایک خط میں ایسی تمام غلطیوں کو جمع کرنا بڑا مشکل ہے، میرا خیال ہے کہ

زبان کی غلطیاں آگے چل کر ٹھیک ہی ہوجاتی ہیں۔ لیکن ایک چیز جس کی طرف میں نے اپنے تنقیدی مضمون میں سب سے زیادہ زور دیا ہے، اگر اس کا رخ غلط ہوگیا تو پھر اصلاح حال محال ہوجاتی ہے اور مشق و مزاولت اس غلطی کو پختہ کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ ہے ایک ادیب اور شاعر کی فکر۔

میں نے سب سے بڑا اعتراض یہی کیا ہے کہ افسانۂ یوسف زلیخا جس فکر کے تحت لکھا گیا ہے وہ فکر ہی غلط ہے۔ آپ کسی وقت، جس وقت کہ آپ واقعی عورت ہوں (اس فقرے کو طنز پر محمول نہ فرمایئے گا۔ میں سنجیدگی سے عرض کرتا ہوں) اپنی حقیقی نسائیت کو اپنے اوپر طاری کرکے اپنے افسانے کو شروع سے آخر تک پڑھ جایئے۔ دیکھیے آپ کا افسانہ سراسر ''لذت ہی لذت'' ہے یا نہیں؟ ذرا دیر کے لیے اپنے گیارہ ادیبوں کی تعریفوں کے تاثر سے دل و دماغ کو خالی کرکے پڑھیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ شرم سے پانی پانی ہوجائیں گی۔

یوسف زلیخا کی تنہائی کا ایک وہ منظر ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ اسی تنہائی کا ایک نقشا آپ نے کھینچا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ''درآغوش ......'' والا جملہ ایک مشرقی خاتون اور وہ بھی مسلمان کے قلم سے نکل کیسے گیا؟ پھر اس وقت کا سماں جب زلیخا نے خواتینِ مصر کو جمع کرکے یوسفؑ کو بلایا اور جب وہ یوسفؑ کے حسن و جمال کی قائل ہوگئیں تو بھرے مجمع میں زلیخا کی زبان سے نہ معلوم کس شاعر کی ''جانِ زلیخا، دامانِ زلیخا، ارمانِ زلیخا'' والی عریاں اور حیا سوز غزل پڑھوادی۔

آپ کے افسانے میں مجھے یہ ''لذتیت'' بری طرح کھٹکی۔ آپ یاد رکھیں'' دنیا میں جب لذت کا غلبہ ہوجاتا ہے تو وہ تباہی اور بربادی سے بچتی نہیں۔ اسی لذت نے پچھلی نہ جانے کتنی قوموں کو ڈبویا۔ آج مغرب اسی لذت کی طرف بڑھ رہا ہے اور افسوس کہ ہماری مسلمان خواتین بھی اسی رو میں بہی چلی جارہی ہیں۔ میں آپ کو ایک بات اور بتاؤں ۔ میں نے آپ کے افسانے پر تنقید کی۔ اس کی غرض یہ نہیں تھی کہ تنقیدی مقالات میں ایک مقالے کا اضافہ ہوجائے میں نے دیکھا کہ اس افسانے کی تعریف میں شمارہ بہ شمارہ ''ارباب نشاط'' لکھے ہی چلے جارہے ہیں۔ نیز حلقۂ حجاب، کی خواتین بھی اس افسانے

کی طرف متوجہ ہونے لگی ہیں۔ تو میں نے ضروری سمجھا کہ اب قلم اٹھاؤں۔ اگر میں اس موقع پر قلم نہ اٹھاتا تو میں اپنی ملت کا غدار ہوتا اور پھر اس زندگی کے بعد جب آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیشی ہوتی اور مجھ سے پوچھا جاتا۔ ''بندے تیرے ہاتھ میں قلم دیا گیا تھا تو نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ تو بتایئے! میرے پاس اس کا کیا جواب ہوسکتا؟ اور وہاں کی پکڑ سے مجھے کون بچا سکتا۔ یہ تھا میرا مقصد ــــ آپ فرمائیں، افسانہ یوسف زلیخا لکھتے وقت آپ کے پیش نظر کیا مقصد تھا؟

اب رہی آپ کی وہ تحقیق کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کالے تھے یا گورے چٹے؟ آپ نے انھیں سانولا، متناسب الاعضاء اور صحت و توانائی سے بھرپور جوان دکھایا۔ اگر ایک نئی بات ہی لکھنا تحقیق ہے تو ایسی بے سروپا باتیں بے تکان کہی جاسکتی ہیں۔ ''ابراہیمؑ اور نمرود کا دنیا میں وجود ہی نہیں تھا۔ موسیٰ اور فرعون ہندستان کے مصرا (مشرا) برہمنوں کے خاندان سے تھے۔ کعبے میں سنگ اسود کی شکل میں اب بھی مہادیو جی کی پوجا ہوتی ہے ــــ وغیرہ وغیرہ ــــ

ان موضوعات پر قلم کو آزاد چھوڑ دیجیے۔ پھر دیکھیے، دنیا چاہے ایسے صاحب قلم پر تھوک دے مگر شہرت کہیں نہیں گئی۔ وہ تو حاصل ہو ہی جائے گی اور دہریت پسند طبقہ تو ایسا لے اڑے گا جیسا آپ کے افسانے کو ''ارباب نشاط'' لے اڑے۔ آپ میرے ان غیر سنجیدہ جملوں پر ہنس دیں گی۔ مگر معاف کیجیے گا۔ آپ نے بھی تو حضرت یوسفؑ کو سانولا ثابت کرنے کے لیے متانت کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ آپ فرماتی ہیں:

> ''دن رات دھوپ میں کام کرنے والے اور گرم جگہ کے رہنے والے، خصوصاً گنوار چرواہے عام طور پر سیاہ ہوتے ہیں۔''

آپ نے اپنے اس خیال کو دلیل قرار دیا حالانکہ یہ ہرگز دلیل نہیں، یہ تو آپ کا قیاس ہے۔ آپ نے دیہات کے مہذب اور شائستہ لوگوں کے رہن سہن اور ان کے روپ رنگ کا مشاہدہ ہی نہیں کیا۔ دیہات میں جو لوگ شائستگی کے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں (جیسے اسرائیلی خاندان، جس کی ابتدا ہی حضرت یعقوب علیہ السّلام سے ہوئی جو نبی تھے اور نبیوں کی شائستگی عیاں ہے)۔ ان کے رنگ روپ کے نکھار کو آپ دیکھیں تو دنگ رہ جائیں اور پھر اپنے قیاس کو آگ لگا دیں۔

دیکھیے، آپ نے اپنے افسانے میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت یوسف پہلی بار بکریاں چرانے گئے تھے اور اسی پہلی بار وہ واقعہ پیش آ گیا ورنہ بارہ تیرہ برس کی عمر تک باپ نے محبت کے مارے انھیں گھر سے باہر نکلنے نہیں دیا نیز آپ نے افسانے کی ابتدا میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کو خدا نے چاند سا بیٹا دیا۔

ذرا غور مایئے، کیا وہ چاند سا بیٹا ایک دن کے دو تین گھنٹوں میں ہی دھوپ سے سانولا ہو گیا؟ ایسا تو آپ ہی قیاس کر سکتی ہیں۔ کسی سمجھ دار آدمی سے توقع نہ کیجیے۔ آپ کے اس قیاس اور اس نئی تحقیق پر ارباب نشاط جھومیں تو جھومیں، دوسرا تو سنی ان سنی کر دے گا۔ اچھا چھوڑیے ان ساری باتوں کو، یہ بتایئے۔

- کیا آپ اپنا یہ ''عظیم افسانہ'' اپنے والد صاحب کے سامنے پڑھ سکتی ہیں؟
- کیا آپ اپنا یہ ''عظیم افسانہ'' اپنی والدہ صاحبہ کے سامنے پڑھ سکتی ہیں؟
- کیا آپ اپنا یہ ''عظیم افسانہ'' اپنے کسی بزرگ کے سامنے پڑھ سکتی ہیں؟

اگر آپ مسلمان ہیں تو! اور میرا حسن ظن یہی ہے کہ آپ مسلمان ہی ہیں۔

محترمہ! آپ نے اپنے خط میں جن مباحث کو چھیڑا ہے ان کا جواب جو کچھ اور جیسا مجھ سے بن آیا، آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اگر میں نے کوئی غلط بات کہی ہو تو اس کی نشان دہی ضرور کریں۔

والسّلام

خیر اندیش۔ مسرور

احساس

مسرؔور ادیب کا یہ خط پڑھ کر وہ سوچنے لگی۔ یہ میں نے کیا کیا؟ میں نے کیوں اس سے اپنے افسانے کی خامیوں کی نشان دہی کرائی ـــــ یہ تو ''آ بیل مجھے مار'' والی مثل ہوئی۔ اس نے جو فکری اور لفظی گرفت کی اس کا جواب ہی کیا ہوسکتا ہے؟ مگر عجیب سخت قسم کا آدمی ہے۔ ذرّہ برابر بھی تو رعایت سے کام نہیں لیا اس نے اُف توبہ!'' دن رات دھوپ میں'' والے فقرے کی کھلی ہوئی غلطی میں نہ سمجھ سکی۔ وہ تو بڑا اچھا ہوا، میں نے ماہنامہ ''نشاط'' یا حجاب میں ردّ وقدح اور جواب الجواب والی مضمون بازی شروع نہیں کی ورنہ جن غلطیوں سے مجھے اس خط کے ذریعے آگاہ کیا گیا ان کا چرچا رسالوں میں ہوتا اور پھر کیسی کرکری ہوتی؟ ''حجاب'' میں اس نے جو کچھ لکھا، اس میں تو صرف فکری بحث چھڑی تھی، باقی سب ڈھکا چھپا رہا۔ اس خط میں تو اس نے آفت ہی ڈھادی۔ کیا کچھ نہ کہہ گیا ظالم!

وہ دیر تک اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہی۔ اس کے بعد اس نے خط پھر پڑھا۔ ''حبِّ وطن'' اور ''حُبّ وطن'' والی بحث پر مسکرائی۔ اسے خیال آیا کہ پچھلے دنوں تعلیمی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا عربی نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے یہ شعر پیش کرتے ہوئے ''حبِ وطن'' ہی پڑھا تھا۔ ایک نقطے کے نکتے کو وہ بھی نہ سمجھ سکے اور دعویٰ ہے کہ ملک بھر میں عربی کے واحد زبان داں وہی ہیں۔ اس جگہ وہ پھر مسکرائی۔ مسرؔور کا خط اٹھایا۔ خط کا وہ حصہ پھر پڑھا جس میں مسرور نے اپنے کو اسناد کے اعتبار سے بونا لکھا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔ اس کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا'' مجھے تو اس بونے کے آگے بڑے بڑے لوگ بونے نظر آرہے ہیں۔ اس کے بعد اس نے مسرور کو لکھا:

محترمی!

تسلیم

آپ کا خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے آپ کے خط کو کئی بار پڑھا اور جب پڑھا، ایک خاص اثر میرے دل ودماغ نے قبول کیا۔ آپ نے اپنے خط میں میرے افسانے کی لفظی اور فکری غلطیوں کی جو وضاحت فرمائی اس سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ ساتھ ہی میں نے آپ کی اخلاقی قدروں کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور حلقۂ نشاط کے وہ گیارہ ادیب جنہوں نے میرے افسانے کی تعریف کے پُل باندھے۔ سب کے سب وہ کچھ نظر آئے جو آپ نے دبے لفظوں میں ان کے متعلق اشارہ کیا۔ میرے افسانے کے ذریعے (جیسا کہ آپ نے لکھا ہے) چاہے انہوں نے مجھے ـــــ (آپ کی یہ ذراسی لکیر بھی بڑی معنی خیز ہے) دیکھا یا نہ دیکھا ہو، لیکن آپ کے خط نے انہیں میرے سامنے بے نقاب ضرور کردیا۔ اب قبل اس کے کہ میں آپ کے خط کا جواب دوں اور آپ کی جن باتوں سے مجھے اختلاف ہے ان کے متعلق کچھ لکھوں۔ آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ نے جواب سے نوازا تو پھر میں تفصیل سے کچھ عرض کرسکوں گی۔

آپ کا خط پاکر مجھے خوشی کے ساتھ کسی حد تک شکایت بھی پیدا ہوگئی۔ آپ نے نہایت لطیف لفظوں کی آڑ لے کر وہ تیر چلائے ہیں جن سے میرا دل بری طرح زخمی ہوا۔ مجھے آپ سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ حضرت یوسفؑ کے سانولے ہونے کے سلسلے میں، میں نے جو دلیل دی اسے میرا قیاس کہہ کر ٹھکرادیا۔ میں نے آپ کا خط پڑھ کر سورۂ یوسف شروع سے آخر تک پھر پڑھ ڈالی لیکن ان کے متعلق صبیح، جمیلؔ، حسین جیسے الفاظ کہیں نہ ملے۔ ایک جگہ یہ ضرور کہا گیا ہے کہ:

''جب وہ (یعنی حضرت یوسفؑ) پوری جوانی کو پہنچ گیا''۔

قرآن کے اس فقرے سے ان کے گورے چٹے ہونے کا کیا ثبوت ملتا ہے؟ میں نے اپنے افسانے میں عام محاورے کے مطابق لکھ دیا کہ خدا نے یعقوبؑ کو چاند سا بیٹا دیا۔ بس آپ نے لفظ چاند پکڑلیا اور کھینچ تان کر اپنے مطابق نتیجہ نکال لیا۔ یہ کیسا انصاف ہے آپ کا؟

اس کے بعد حبِّ وطن اور جبِّ وطن کے متعلق گو آپ کی بات ٹھیک معلوم ہوتی

ہے، مگر ذوق سلیم کو جبّ وطن کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ''جُبّ'' شاعری کا لفظ ہی نہیں، اگر شاعر نے جیسا کہ آپ کا قیاس ہے ''جُبّ وطن ہی کہا ہے تو یہ عربی کا موٹا اور ثقیل لفظ فارسی زبان کے لیے ''غریب'' ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری اس خلش کو ضرور دُور فرمائیں گے۔

آپ نے اپنے خط میں مقصد اور بے مقصد والی بات پھر دہرائی ہے۔ میں آپ سے عرض کردوں۔ میری قلمی کاوش کا مقصد ادب کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر میں عمر میں ایک مضمون بھی ایسا لکھ سکوں جس سے ہماری زبان میں کچھ بھی اضافہ ہو سکے تو میں سمجھوں گی کہ جو کچھ پڑھا اس کا پھل مل گیا۔

آپ کی مقصدیت اور بے مقصدیت کی بحث میں مجھے بُری طرح جو چیز کھٹکی وہ آپ کا وہ خیال ہے جو آپ نے میرا افسانہ پڑھ کر خاص میری ذات کے متعلق قائم کرلیا۔ میرا افسانہ پڑھ کر شاید آپ مجھے کچھ سے کچھ سمجھ بیٹھے۔ تو مہربان! میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں گی کہ کسی شاعر یا ادیب کی ذاتی تصویر اس کے اشعار اور مضامین میں تلاش کرنا صحیح نہیں اور اگر ایسا ہے تو پھر کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اور مفتیانِ ادب متین ان شعراء اور ادباء کے بارے میں جو واقعی متقی اور پرہیزگار تھے مگر شاعری کے حمّام میں ننگے نظر آرہے ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میرا اشارہ کن بزرگوں کی طرف ہے؟ اگر آپ نہ سمجھے ہوں تو ان کے نام اور ان کا کچھ کلام لکھ کر بھیج دوں۔

میرا خیال ہے کہ آپ جوشِ تحریر میں وہ کچھ لکھ گئے جو آپ کو نہ لکھنا چاہیے تھا۔ میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی، اگر آپ اپنے خط پر نظرِ ثانی فرما کر جواب سے سرفراز فرمائیں۔

والتسلیم
مخفیؔ

مسرورؔ کو جب یہ خط ملا اور اس نے اسے پڑھا تو خط کے ابتدائی حصے سے اسے بڑی خوشی ہوئی اور اس نے مخفیؔ کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ وہ ایک انصاف پسند عورت ہے۔ لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اس کا انہماک اور انہماک کے ساتھ تعجب بڑھتا گیا اور جب اس نے خط کا آخری حصہ پڑھا تو اس نے سر پکڑ لیا اس کے بعد اس نے مخفیؔ کو یوں مخاطب کیا:

محترمہ بہن!

السلام علیکم ورحمتہ اللّٰہ وبرکاتہٗ

آپ کا شکایت نامہ ملا۔ میں آپ کے خط کے آخری پیراگراف کو پڑھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اپنے خط میں کیا لکھا اور آپ نے کیا گمان کرلیا۔ بھلا میں آپ کو کچھ سے کچھ کیوں سمجھ بیٹھتا؟ حاشا وکلّا، میرے بھائی نے مجھے ایسی تعلیم نہیں دی اور نہ میرا مزاج ہی ایسی بدگمانیوں سے جوڑ کھاتا ہے کہ میں کسی مسلمان مرد یا عورت تو درکنار، کسی غیر مسلم مرد اور عورت سے کوئی ''ظن'' قائم کروں۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے قرآن کی آیت ''اِنَّ بَعْضَ الظَّنِ اِثْمٌ'' یاد آگئی اور میں توبہ توبہ کرنے لگا۔ آپ کا خط پڑھنے کے بعد میں نے اپنا خط پھر پڑھا۔ میں تو اپنے خط میں وہ بات نہ پاسکا جو آپ نے اپنے اوپر محمول فرمائی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنا عیب انسان کو خود نظر نہیں آتا۔ اس لیے میں آپ کی شکایت کو تسلیم کیے لیتا ہوں تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے آپ کی ذات پر کوئی کھلی یا چھپی چوٹ نہیں کی۔ اگر آپ نے کسی مقام پر محسوس فرمایا تو اسے میرے اظہار بیان کی کوتاہی سمجھیے۔ میری نیت صاف ہے اور میرا خدا اس کا گواہ ہے۔ آپ بھی میری طرف سے اپنی نیت صاف رکھیں۔ نیت صاف رکھنے سے بدگمانی کو بار پانے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کے بعد جواب ملاحظہ فرمایئے:

حضرت یوسفؑ کے سانولے ہونے کی نسبت آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں جس دعوے کو دلیل کہہ رہی ہیں وہ دلیل آپ کے دعوے کی طرف رہنمائی نہیں کرتی۔ دلیل لانا تھی تو یوں لانا چاہیے تھی کہ:

- میں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا ہے کہ وہ سانولے تھے یا:
- فلاں شخص راوی ہے اور اس نے فلاں فلاں واسطوں سے روایت کی ہے کہ حضرت یوسفؑ سانولے تھے یا:
- تاریخ کی فلاں کتاب میں لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ سانولے تھے۔

ظاہر ہے کہ آپ نے تو حضرت یوسفؑ کو دیکھا نہیں۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ

آپ کہیں کوئی ایسی روایت پا گئیں یا پھر کسی تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ حضرت یوسفؑ سانولے تھے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو حوالہ دیجیے، میں مان لوں گا۔ اٹکل سے تیر چلانا آپ جیسی پڑھی لکھی خاتون کو زیب نہیں دیتا۔

آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ سورۂ یوسفؑ میں انہیں کس جگہ صَبِیحٌ جَمِیلٌ حَسِینٌ کہا گیا ہے؟ اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ یہ الفاظ تو واقعی سورہ میں نہیں۔ لیکن ان سارے لفظوں سے بڑھ کر ایک لفظ اسی سورہ کی ایک آیت میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ شاید آپ پڑھتے وقت اس پر سے سرسری طور پر گزر گئیں۔ آپ نے خیال نہیں فرمایا۔ سورہ کی اکتیسویں آیت میں ہے کہ خواتین مصر نے یوسفؑ کو دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھیں:

''ارے' یہ انسان کب ہے، یہ تو ایک بزرگ فرشتہ ہے!!''

میرا خیال ہے کہ لفظ فرشتہ اردو میں نیک اور بھولے آدمی کے لیے بولا جاتا ہے، اسی لیے آپ کی توجہ اس کی اصلیت پر نہیں گئی اور سمجھ بیٹھیں کہ حضرت یوسفؑ ایک سیدھے سادے اور بھولے بھالے فرشتہ صفت انسان تھے۔ حالانکہ آیت کا سیاق وسباق صاف بتاتا ہے کہ لفظ فرشتہ کا اس جگہ وہ مطلب نہیں جو اردو میں سمجھا جاتا ہے بلکہ اپنی تخلیقی حیثیت کو واضح کرتا ہے۔ اب آپ ایک مبتدی طالب علم ہی سے پوچھ لیجیے، وہ آپ کو بتا دے گا کہ فرشتے نور سے بنائے گئے ہیں اور نور کو اب تک سارے لوگوں نے اُجلا، سفید اور چٹا ہی مانا ہے تو فرمائیے اب کیا فرماتے ہیں ادبِ اردو کے محققین اور عربی کے متجرین اس بارے میں کہ یوسف کالے تھے یا گورے، سانولے تھے یا چٹے؟

''حبِّ وطن'' اور ''جُبّ وطن'' کے متعلق آپ نے میری توجیہ تسلیم کر لی۔ یہ آپ کی حق پسندی کا ثبوت ہے لیکن آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ذوق سلیم کو اچھا نہیں لگتا۔ اوّل تو آپ نے ذوق سلیم کی تعریف نہیں فرمائی۔ دوسرے یہ کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کسی کو ''جُبّ وطن'' ٹھیک ہونے کے باوجود اچھا نہیں لگتا تو یہ اچھا نہ لگنا کیا بات ہوئی ــــــ؟ اچھا نہ لگنے سے کہیں حقیقت پر حرف آتا ہے۔ چمگادڑ کو سورج کی روشنی اچھی نہیں لگتی،

افیونی کو پانی اچھا نہیں لگتا، بخار میں آدمی کو کھانا اچھا نہیں لگتا، ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد کو گوشت اچھا نہیں لگتا۔ گدھے کو آم اچھے نہیں لگتے۔ کتّے کو گھی اچھا نہیں لگتا۔ (کہیے تو اور گنا تا چلا جاؤں) تو بھلا کسی کے اچھا نہ لگنے سے سورج، پانی، کھانا، آم، گھی اور گوشت کی اہمیت سے کیوں کر انکار کیا جا سکتا ہے۔ رہ گیا کسی لفظ کا اچھا نہ لگنا یہ تو رائج ہونے پر موقوف ہے۔ موٹے سے موٹا اور ثقیل سے ثقیل لفظ چل پڑے اور لوگوں کی زبان پر رواں ہو جائے اچھا لگنے لگے گا۔ شروع شروع میں انگریزی کے الفاظ 'پروپیگنڈہ، موڈ اور بور' وغیرہ اردو میں پڑھ کر یا سُن کر لوگ کیسا کیسا ناک بھوں چڑھاتے تھے، مگر اب یہی الفاظ سُن کر یا پڑھ کر نہ کسی کا موڈ بگڑتا ہے اور نہ کوئی بور ہوتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ عربی کا لفظ "جبّ" فارسی زبان میں "غریب" معلوم ہوتا ہے تو آپ کو ایک لفظ کا "غریب" ہونا تو اتنا کھٹکا مگر عربی کے پورے پورے مصرعے فارسی زبان میں پڑھ کر آپ کے "ذوق سلیم" کے ماتھے پر ذرا شکن نہیں آئی۔

اَلا یا ایّھا السّاقی اَدرِ کأساً وَناوِلھا ۔ کہ عشق آساں نمود اول دلے افتاد مشکلہا

محترمہ! آپ نے اپنے خط کے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ "کسی شاعر یا ادیب کی ذاتی تصویر اس کے اشعار اور مضامین کے آئینے میں دیکھنا صحیح نہیں"۔ اچھا، میں آپ کی اس بات کو مانے لیتا ہوں لیکن یہ بات منوا کر آپ نے بقول اقبال (قدرے ترمیم کے ساتھ) "اپنی منقاروں سے پھندہ کس لیا خود جال کا"۔ افسوس صد افسوس! آپ کیسی منافقت کی بات منوانے پر مصر ہیں۔ میں اپنے مضامین میں رونا کس بات کا روتا رہا ہوں؟ میں یہی تو کہتا ہوں کہ شاعر و ادیب کے قول و عمل میں ہم آہنگی ہونا چاہیے۔ دل میں کچھ اور قلم میں کچھ۔ یہ ادبی منافقت ہے۔ میں یہ بات یوں ہی الل ٹپ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے سامنے ایک تعلیم یافتہ خاتون ہے، میں اسے دورُخے پن سے بچانا چاہتا ہوں اور یہ کہ میری اس بات کی پشت پر قرآن ہے۔ وہ بھی یہی پکارتا ہے 'لِمَ تَقُولُونَ مَالاَ تَفعَلُونَ' (وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں) میں آپ سے اصرار کرونگا کہ آپ جواب دیں۔ کیا آپ کو یہ منافقت پسند ہے؟ میرا دل کہتا ہے کہ آپ کا دل ایسی منافقت کو ہرگز

پسند نہیں کرسکتا۔ حال وقال کی ہم آہنگی ہی سے سننے والے پر اثر بھی ہوتا ہے۔ اس وقت ایک شاعر کی غزل کا مقطع یاد آگیا۔ اس کے تخلّص کی جگہ آپ کا نام لکھ کر عرض کرتا ہوں ؎

جہاں میں آگ لگ جاتی ہے مخفیؔ مگر کچھ ربط ہو قلب وزباں میں

ایک بات اور رہ گئی۔ آپ نے اپنی نگارشات کا مقصد مبہم مبہم سا تحریر فرمایا ہے۔ ''خدمت ادب'' سے آپ کا کیا منشاء ہے؟ یہی نا کہ ذوق زمانہ سے مرعوب ہوکر بے مقصد اور غیر ضروری باتوں سے ادب کو بھردیں اور بازار کی مانگ دیکھ کر بازاری ادیبوں کی طرح مخرّبِ اخلاق ناولوں اور غیر سنجیدہ افسانوں سے ادب کو گندہ کردیں۔ معاشرے کے بگڑنے میں جانے کیا کسر رہ گئی تھی، جس کی تکمیل آپ افسانۂ ''یوسف زلیخا'' جیسے ادب کے ''شہ پاروں'' اور ''عظیم افسانوں'' سے کرنا چاہتی ہیں۔ آپ نے میری فکری دعوت میں دلچسپی نہیں لی۔ خیر، مجھے اس کا شکوہ نہیں۔ لیکن آپ پر یہ واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت صالح ادب بے انتہا مظلوم ہورہا ہے۔ ظالم اس کی گردن پر چھری پھیر دینا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں بھی قلم کی تلوار دی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ کی تلوار ظالم کی گردن پر پڑتی ہے یا مظلوم کا سر اڑاتی ہے؟ بہر حال ایک دن آپ سے بھی قلم کی ہر جنبش کا حساب لیا جائے گا۔ آپ نے اس پر بھی غور فرمالیا۔

والسّلام

مسرورؔ

مسرورؔ نے یہ خط نسوانی نفسیات کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہوئے لکھا تھا۔ چنانچہ مخفی نے اسے بہت پسند کیا۔ بار بار پڑھا اور ہر بار محظوظ ہوئی۔ خصوصاً خط کا وہ ابتدائی حصّہ اسے بہت پسند آیا۔ جس میں مسرورؔ نے ایک پورا پیراگراف معذرت کی نذر کرکے کھلے لفظوں میں اقرار کرلیا کہ اس کی نیت صاف ہے اور اگر کوئی بات کھٹکی ہوتو اسے اظہار بیان کی کوتاہی سمجھنا چاہیے ——— یا پھر یہ جملہ کہ آپ جیسی پڑھی لکھی خاتون کو اٹکل سے تیر مارنا زیب نہیں دیتا ——— یا پھر آگے چل کر وہ فتویٰ نما عبارت جو اس نے خود لکھی تھی

مسرورؔ نے اسی پر جھونک دی۔ اس فتویٰ نما عبارت میں خاص مخفیؔ پر ایک لطیف طنز مخفی تھا۔ پھر بھی وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی ——اور پھر آگے چل کر جب اپنے متعلق اس نے یہ جملہ پڑھا کہ ”یہ آپ کی حق پسندی کا ثبوت ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ”کتنا شریف آدمی ہے مسرور!“

جب لوگ ایک دوسرے سے حسنِ ظن قائم کر لیتے ہیں تو پھر انہیں ایک دوسرے کی ایک ایک بات بھلی لگنے لگتی ہے۔ یہی کیفیت مخفیؔ کی ہوئی چنانچہ مسرورؔ کے خط کا جواب اس نے بڑی خندہ جبینی کے ساتھ دیا۔

●

اعتراض

مکرمی !

سلام و نیاز !

آپ کا یہ خط پڑھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ اس میں وہ تیر و نشتر نہیں جو میں آپ کی پچھلی تحریروں میں اکثر محسوس کرتی رہی ہوں۔ یہ خط آپ نے بڑی دل سوزی کے ساتھ لکھا ہے۔ آپ سلجھے ہوئے دل و دماغ کے مالک اور بہت ہی مخلص ہیں۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں نے ایک قابل اور مہذب شخص سے مراسلت کا شرف حاصل کیا۔ میں نے آپ کے خطوط سے بہت کچھ سیکھا۔ آپ سے تبادلۂ خیال کر کے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ میں اب تک اندھیرے میں تھی اور میرا قلم میری نادانی کی وجہ سے اندھیری وادیوں میں بھٹک گیا تھا۔ آپ نے مجھے پیچ و خم سے نکال کر راہ راست پر لا کھڑا کیا۔ آپ کے مدلل جوابات نے میرے قلم کو صحیح رُخ پر موڑ دیا۔ ''موڑ دیا'' میں نے آگے کی بات کہہ دی۔ یوں سمجھیے ۔ آپ کے استدلال نے میرے قلم کو توڑ دیا۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ اپنے قلم کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دوں جو آپ نے اپنایا ہے لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اگر اردو ادب میں اسلامی اقدار کو بنیاد بنا دیا جائے گا تو معاف فرمایئے گا ، وعظ کی کچھ کتابیں تصنیف کر دی جائیں گی اور وہ بقول کسے ''مسجد کے لوٹوں کا ادب بن کر رہ جائے گا''۔ اردو میں اسلامی اقدار کو مرکز بنا کر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس ادب کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے جو اس مرکز سے ہٹ کر کہا گیا ہے۔ اس الجھن نے مجھے دوراہے پر لا کر کھڑا

کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ براہِ کرم کچھ وضاحت فرمائیے تاکہ مجھے اطمینان حاصل ہو۔

والسّلام
"مخفی"

مخفی کے اس خط سے مسرور کو بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً جواب دیا۔

محترمہ بہن! السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط پاکر مجھے کتنی خوشی ہوئی؟ اس کا اندازہ ایک بے سروسامان فوج کے اس سپہ سالار سے پوچھیے جو ایک عظیم اور مہلک ہتھیاروں سے آراستہ لشکر پر حملہ آور ہونے چلے اور غیر متوقع طور پر اس کی فوج میں ایک بہترین سپاہی نہیں، کمانڈر کا اضافہ ہوجائے۔ آپ کا خط پڑھ کر باغ باغ ہونے کا مطلب صحیح معنوں میں اب میری سمجھ میں آیا۔ میرے خدا نے ایک صاحب قلم اور ذہین خاتون کو ہمارے حلقے میں شامل فرمادیا۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے اور کیا ہوسکتی ہے؟ اب رہے آپ کے دو ایک اور شکوک، وہ بھی ان شاء اللہ رفع ہوجائیں گے۔

عجیب وغریب اتفاق ہے، ادھر آپ نے اردو ادب میں اسلامی اقدار کی بات چھیڑی، اُدھر ایک ادبی انجمن کی طرف سے اسی موضوع پر تقریر کرنے کی مجھے دعوت دی گئی ہے۔ میں نے اس کے لیے مواد فراہم کرلیا ہے اور اشارات بھی قلمبند کرلیے ہیں۔ بس لکھنا باقی ہے۔ یہ میں آپ سے عرض کردوں کہ سوائے ان خطوط کے جو آپ کی خدمت میں روانہ کیے، باقی اپنی تمام تحریریں میں نے بھائی صاحب کو دکھائے بغیر منظر عام پر لانے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ اس کی وجہ آپ جانتی ہیں۔ آپ نے اپنے خطوط میں بار بار مجھے توجہ دلائی ہے۔ آپ نے بھی مجھے اس پر ٹوکا اور بھائی صاحب نے بھی بارہا روکا لیکن مجھے افسوس، اور افسوس کے ساتھ ندامت ہے کہ میری تحریر میں دل سوزی کے ساتھ دل دوزی کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہو ہی جاتا ہے۔ کیا کروں، میرا یہ عیب دور نہیں ہوتا۔ اب مَیں جو تقریر تیار کر رہا ہوں اسے بھائی صاحب کو ضرور دکھاؤں گا۔ خدا

نے چاہا تو اس کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھی روانہ کروں گا۔ اس سے آپ کے شکوک ان شاء اللہ دور ہوجائیں گے۔ سردست کچھ موٹی موٹی باتیں آپ کے اطمینان کے لیے عرض کیے دیتا ہوں۔

آپ نے اندیشہ ظاہر فرمایا ہے کہ اسلامی اقدار کو اپنانے کے بعد ایک روکھا پھیکا ادب منظرِ عام پر آئے گا۔ میں آپ کے اس اندیشے سے متفق نہیں ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ دنیا میں وہی ادب باقی رہا ہے جو یا تو خالص اسلامی ہے یا پھر اسلامی ادب سے قریب ہوکر تیار کیا گیا ہے یا کم از کم اس سے متصادم نہیں ہے۔ میں اس خط میں زیادہ مثالیں تو نہیں دے سکتا۔ میری تقریر میں شرح وبسط کے ساتھ یہ مثالیں ہوں گی۔ ہاں، آپ کی تسکین کے لیے عرض کردوں کہ ارباب ادب نے جن بزرگوں کو اردو کے اساطین تسلیم کیا ہے ان میں بیشتر اسلام سے متاثر ہی نہیں، اس کے وفادار تھے۔ ان میں شبلیؒ کا تو وہ مقام ہے کہ انہوں نے سیرت النبیؐ، الفاروقؓ، شعر العجم اور موازنہ انیس ودبیر وغیرہ کتابیں لکھ کر ملک کے سارے ادیبوں سے اپنا لوہا منوالیا۔ پھر مولانا آزاد نے قلم ہاتھ میں لیا اور اس زور بیان کے ساتھ اسی مقصد کو اپنے شعلہ بار اور سحر آفریں قلم سے پیش کیا کہ ارباب نشاط دنگ رہ گئے۔ الہلال کے فائل آج بھی اس پر گواہ ہیں۔ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو مثال میں پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں اسلامی قدریں سموئی ہوتی ہیں اور بے پناہ طنز کے ساتھ وہ بلا کی ادبی چاشنی پائی جاتی ہے کہ موافق تو مزہ لے لے کر پڑھتا ہی ہے، مخالف کو بھی پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔

سب سے آخر میں مولانا مودودی نے اسی روکھے پھیکے عنوان پر قلم اٹھایا۔ انہوں نے اسلامی اقدار کی بنیادوں کو جس انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ گو اُسے ہنوز ادبی حیثیت سے پرکھا نہیں گیا اور اس کی خاص وجہ ہے۔ ابھی تو مولانا مودودی کے دینی استدلال پر ہی مخالف وموافق کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں، ابھی لوگوں کو ادبی حیثیت سے مولانا کے لٹریچر کو کسوٹی پر پرکھنے کا دھیان ہی نہیں آیا۔ جس دن ان کے لٹریچر کو کسوٹی پر پرکھا جائے گا اس وقت دیکھیے گا کہ چمنستانِ اردو میں کیسے سدا بہار، خوشبودار اور رنگا رنگ پھول کھلے ہیں اور اسلامی اقدار کا سہارا پا کر اردو ادب کتنا آگے بڑھ گیا ہے؟

ایک بات اور —— آپ جانتی ہیں کہ جس وقت قرآن نازل ہورہا تھا اس وقت عرب کے زعمائے ادب اپنے مقابلے میں ساری دنیا کو ''عجم'' کہتے تھے۔ آخر ان کی زبانیں قرآن سن کر کیوں گنگ ہوگئیں؟ قرآن کے چیلنج فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ سے عرب کے منہ پر تالا کیوں لگ گیا؟ کیا قرآن نے فصاحت اور بلاغت کے بغیر ہی یہ کامیابی حاصل کرلی تھی؟ زمانۂ جاہلیت کے ''ہمچو ما دیگرے نیست'' قسم کے لوگوں کو اس کے بغیر ہرگز مات نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اسلامی قدروں کو سامنے رکھ کر جو شعر کہا جائے گا وہ وعظ بن کر رہ جائے گا۔ لیکن میرا مطالعہ کچھ اور کہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اردو شاعری میں جس شعر نے سرِ فہرست جگہ پائی وہ وہی ہے جو اسلامی اقدار سے متاثر ہوکر لکھا گیا یا ان سے قریب ہوکر کہا گیا یا کم از کم اسلامی قدروں سے متصادم نہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

میر تقی میرؔ کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ اردو شاعری میں ان کا کتنا اونچا مقام ہے، تمام بڑے بڑے شعراء نے کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

انہی میرؔ صاحب نے کہیں فارسی کا یہ شعر دیکھ لیا:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

بس پھر میرؔ صاحب کا یہ عالم تھا کہ شعر پڑھتے تھے اور جھومتے تھے اور بے قرار رہتے تھے کہ کسی طرح فارسی شعر کو اردو میں منتقل کردیں۔ آخر اس شاعرِ بے بدل نے اردو میں اس مضمون کو کہہ ہی لیا اور حق یہ ہے کہ خوب کہا۔ فرماتے ہیں ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھالایا

دیکھا آپ نے! آخر اس میں وہ کون سا مضمون ہے جس نے میرؔ صاحب کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ آپ نے تو قرآن پڑھا ہے، آپ سے قرآن کی یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں یعنی دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں پر امانت کا بوجھ ڈالا

گیا۔ لیکن سب نے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا۔ لیکن انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا۔

غور فرمائیے، قرآنی حقیقت کو کس خوبی سے نظم کردیا۔ میں آپ سے یہ بھی عرض کردوں کہ میر کے چھ ضخیم دیوانوں میں سے سخن داں حضرات نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق بہتّر بہتّر اشعار چنے ہیں۔ ان اشعار کو میؔر کے تیرونشتر کہا جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تیروں میں ہیروں کی طرح وہی اشعار چمک رہے ہیں جن میں اسلامی قدروں کو سمویا گیا ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آپ کے نزدیک آج وہ مسجد کے لوٹوں کا ادب بن گیا۔

اگر میں اپنے ذوق کے مطابق اشعار پیش کروں گا تو آپ جانب داری کا الزام لگائیں گی لہٰذا دوسروں کے منتخب ''تیرونشتر'' میں سے ہی ایک تیر اور پیش کرتا ہوں، فرماتے ہیں ؎

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

سمجھیں آپ کچھ! مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کا ترجمہ ہے یہ!

اور ملاحظہ ہو ؎

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میؔر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

یعنی ہم انسان دیکھنے میں تو ذرا سے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا پر بھاری ہیں۔ یہ اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جن میں انسان کو اشرف المخلوقات بتایا گیا ہے۔

ایک شعر اور دیکھیے۔ اس میں نظم کیا گیا ہے کہ کسی خاص شے پر انگلی رکھ کر نہیں کہہ سکتے کہ یہ خدا ہے لیکن اسے آیات الٰہی میں سے ضرور کہہ سکتے ہیں۔ فرمایا ؎

پایا نہ یوں کہ کریئے اس کی طرف اشارہ یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

میر صاحب کے ایک شعر پر اور غور فرمالیجیے۔ اس کے بعد دوسرے شعراء کا کلام پیش کروں گا۔ فرمایا ؎

شیخی کا اب کمال ہے کچھ اور حال ہے اور قال ہے کچھ اور

یہ بالکل وہی بات ہے جس کی طرف قرآن نے "لِمَ تَقُولُونَ مَالاَ تَفعَلُونَ" کہہ کے تنبیہ کی ہے کہ وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں!

محترمہ! جس لطف وکمال کے ساتھ یہ اشعار کہے گئے ہیں۔ ان کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مضمون اور ادائے مضمون کی خوبی کو دیکھ کر ہی اہلِ سخن نے میرؔ کے "تیر ونشتر" میں ایسے اشعار کو اونچا مقام دیا ہے۔

یہ تھے میرؔ —— اب مومن خاں مومنؔ کو لیجیے۔ آپ جانتی ہیں کہ مومنؔ کے مقطعے مشہور ہیں۔ کسی مقطع میں ایمان کی باتیں ہیں تو کسی میں کفر کی۔ کہیں خدا یاد آرہا ہے تو کہیں بتوں سے چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ کہیں "مومن نے اس زمین کو مسجد بنادیا" تو کہیں "ضد ہوئی محتسب و پیر مغاں میں مومن" غرض کہ ایک لفظِ مومن کی بدولت مومن نے مضمون آفرینی کے دریا بہادیے۔ جو مقطع کہا خوب کہا، جس رنگ کا کہا، لاجواب کہا —— لیکن ذرا اپنے ذہن پر زور دیجیے، بتائیے۔ آپ کو مومن کے کون کون سے مقطعے یاد ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے حافظے میں یہ مقطعے محفوظ ہوں ؎

مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پیہم سجود پائے صنم پردمِ وداع
مومنؔ خدا کو بھول گئے اضطراب میں

دوستی اس صنم آفتِ ایماں سے کرے
مومنؔ ایسا بھی کوئی دشمن ایماں ہوگا

مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا دشمنِ مومنؔ ہی رہے بت سدا

ایسا گناہ حضرت مومنؔ سے کب ہوا ربط بتان دشمنِ دیں اتہام ہے

سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا
ہم بھی تو مومنؔ ہیں دل نذر بتاں کیوں کر کریں

اگر واقعی ایسے ہی مقطعے آپ کو یاد رہ گئے تو پھر آپ کا اندیشہ آپ سے آپ رفع ہوجانا چاہیے۔ ایمان سے کہیے گا۔ مومنؔ کے یہ مقطعے ''مسجد کے لوٹوں کا ادب'' کہلانے کے مستحق ہیں؟ دل صاحبِ انصاف سے انصاف طلب ہے۔

میرؔ و مومنؔ کے یہاں دیکھ لیا آپ نے! اب ذرا دوسرے استادان سخن کے یہاں دیکھیے، جناب ذوقؔ کا سب سے اچھا شعر یہ مانا گیا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس شعر کے ذریعے اسلام کے بنیادی عقیدے (آخرت) کے محاسبے سے ڈرایا ہے۔ جناب ذوقؔ کے اس شعر پر اربابِ نشاط کے ''چچا غالب'' کیسا کیسا جھومتے تھے؟ اس شعر کی بابت ان کا قول تاریخ اردو کی ہر کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جو شخص ذوقؔ کے اس شعر کو روکھا پھیکا کہتا ہے وہ اپنے ''چچا غالب'' کے ذوق شاعری پر طنز کرتا ہے۔ ایسے شخص کو اپنے ذوقِ ادب پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ انھی ذوقؔ کے ایک شعر میں اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

فرمایا:۔

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دوجہاں کے لیے

ابھی ابھی ''چچا غالب'' کا ذکر آیا تھا۔ ذرا ان حضرت کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دیکھیے، اس شعر میں اللہ کی خالقیت، مالکیت اور بندے کے عدم ادائے شکر پر کیسے بلیغ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد منشی امیر احمد امیر مینائی کا یہ شعر۔

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

آخرت کی جواب دہی کا جو تصوّر پیش کرتا ہے اس کے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

میں اکبر الہ آبادی، مولانا حالی، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں مرحوم کو اس اکھاڑے میں نہیں اُتارتا۔ یہ غریب تو اپنی اسلامیت ہی کے لیے بدنام ہیں لیکن ان کے کلام لوہا طوعاً وکرہاً سب کو ماننا پڑا۔ ان بزرگوں نے اسلامی اقدار کے علاوہ کچھ کہا ہی نہیں اور بالفرض کبھی کچھ کہہ گئے تو زمانے نے خود اسے لوگوں کے ذہنوں سے بھلا دیا۔ کھری چیز کے مقابلے میں کھوٹی چیز نظر انداز ہی کر دینے کے لائق ہوتی ہے۔ زمانہ خود سب سے بڑا نقاد ہے۔

اب میں ان شاعروں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جن کی شاعری سے شراب کی بارش ہوتی ہے۔ اور شاید اسی لیے ارباب نشاط نے انہیں اپنا شاعر کہا ہے۔ جناب ریاض خیر آبادی کو کون نہیں جانتا۔ عمر بھر خمریات کہتے رہے لیکن حقیقتاً ان کے باقی رہنے والے اشعار وہ ہیں جو انہوں نے اسلامی اقدار کا سہارا لے کر کہے ہیں۔ ایک جگہ دنیا کی بے ثباتی کا منظر یوں کھینچا ہے ؎

اور دم لے لو گھنی چھاؤں سے اٹھنے والو
ہم بھی چلتے ہیں ذرا خشک پسینہ ہو جائے

انہی ریاض نے اللہ کی محبت میں سرشار رہنے والوں کا نقشہ ایک شعر میں یوں پیش کیا ہے۔ فرمایا ؎

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوقوں کی ، انداز ہیں دیوانوں کے

جناب ریاض ہی نے توحید کا سہارا لے کر کیا خوب شعر کہا ہے ؎

نکل گئے ہیں بہت دور جستجو کرتے ہمیں خدا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

یہ تھے ریاض مرحوم جنہوں نے خمریات میں نام پیدا کیا لیکن بنتِ عنب کو منہ تک نہ لگایا۔ جگر مراد آبادی تو قولاً وفعلاً شراب میں لت پت رہ چکے ہیں۔ معلوم ہے آپ کو ان کے کون سے اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔ مثالاً میں دو ایک اشعار پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفان محبت عام نہیں

اور

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوالیتی ہے، مانی نہیں جاتی

مجھے احساس ہے کہ خط طویل ہوتا جارہا ہے ورنہ ابھی کتنے ہی اشعار ہیں کہ نوکِ قلم سے ٹپک پڑنے کے لیے بے تاب ہیں۔ یہ تو ہوئے وہ اشعار جن کو ہم اپنے یہاں جگہ دیتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جن اشعار کو ہم کسی طرح اپنے یہاں جگہ دینے کو تیار نہیں۔ اربابِ نشاط انہیں سن کر سر دھنتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کہنے والوں کے یہ غیر اسلامی اشعار بھی اسلامی اقدار ہی کے مرہون منت ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے، صرف ایک اسلامی قدر (آخرت) پر دس پانچ چوٹی کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کیا ہوئیں وہ شوخیاں، بے باکیاں، خود بینیاں
حشر میں کیوں آج کہتے ہو کہ رسوا کردیا

قاتل نے میرے داورِ محشر سے کہہ دیا — ہم خون کرچکے ہیں تو انکار کیا کریں

پڑے ہیں تو پڑے رہنے دو میرے خون کے دھبّے
تمہیں سب حشر میں دیکھیں گے داماں کون دیکھے گا

قیامت بچھی جاتی ہے ہرقدم پر — یہ کون آرہاہے وہی آرہے ہیں

محشر میں ہوگیا جو مراان کا سامنا — گھبرا کے پوچھتے ہیں ارے تم یہاں کہاں

بے نقاب آکر بھری محفل میں یہ کیا کردیا
حشر میں بھی آپ نے اک حشر برپا کردیا

تیرے قدو قامت پہ کچھ غور ہوگا — قیامت میں ہوگا تو کیا اور ہوگا

اس انداز کے ہزاروں اشعار نے سننے والوں سے دادِ سخن حاصل کی ہے۔ لیکن ذرا ایسے اشعار سے لفظ ''حشر اور ''قیامت'' حذف کردیجیے، پھر دیکھیے ان اشعار پر کیا قیامت آتی ہے۔

میں نے اسلامی اور غیر اسلامی دونوں طرح کے اشعار پیش کردیے۔ انہیں پڑھ کر یہ نتیجہ تو نکالا جاسکتا ہے کہ کسی کو شعر کہنے کا سلیقہ ہو اور شعر کیل کانٹے سے درست ہو تو چھا جائے گا لیکن یہ نتیجہ نکالنا بے انصافی ہے کہ اسلامی قدروں کو بنیاد بنا کر جو شعر کہا جائے گا وہ ''وعظ'' اور مسجد کے لوٹوں کا ادب ہوگا اور غیر اسلامی اشعار کے مقابلے میں ہلکا ہوگا۔ یہ کہنے والے دراصل خود ایک ہلکی بات کہتے ہیں۔ کیا غیر اسلامی اشعار کے ڈھیر میں سارے اشعار پسندیدہ قرار پائے؟ ایسا تو نہیں، رطب و یابس سے کون بچا ہے؟ میر کے چھ ضخیم دیوانوں میں سے ستّر بہتّر ''تیرونشتر'' چنے گئے۔ غالب نے اپنا سارا کلام دریابُرد کرکے چند اوراق کا انتخاب رہنے دیا۔ اس انتخاب کے کچھ ہی اشعار موقع و محل سے دہرائے جاتے ہیں۔ ریاضؔ کے دیوان ''ریاضِ رضواں'' کے متعلق ارباب ادب کہتے ہیں کہ یہ ''طلسم ہوش رُبا'' کی جلد نہیں چھپنا چاہیے تھی، انتخاب چھپتا تو اچھا تھا۔

بہن! جانب داری سے کام نہ لیجیے۔ اردو شاعری میں ان اشعار کا انتخاب کیجیے جن میں اسلامی تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ کیجیے۔ جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہونا آپ جیسی صاحب علم خاتون کو زیب نہیں دیتا۔

آخر میں یہ عرض کردوں کہ مجھ سے جو گفتگو آپ سے چل رہی تھی وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور اس کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا وہ سامنے آگیا۔ اب حلقۂ حجاب کی ناظمہ محترمہ سے مراسلت کا سلسلہ شروع کرکے اس حلقے سے رابطہ استوار فرمائیں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اگر ماہنامہ ملاحظہ فرمائیں تو میری گزارش ہے کہ مسلسل و مستقل عنوان ''زمانے کی گواہی'' کا مطالعہ ہر شمارے میں خاص طور سے کریں۔

والسلام

دعاگو

مسرور

اعتراف

یہ خط پڑھ کر مخفی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے پڑا ہوا پردہ یک بیک ہٹ گیا۔ اور اسے وہ کچھ نظر آنے لگا جو اس کی نظروں نے اب تک نہیں دیکھا تھا، اس کے دل نے کہا۔ ''مخفی! کس طلسمِ خیال میں وہمی ساحرہ کی طرح بیٹھی منتر جنتر سے دل بہلا رہی ہے۔ توڑ اس طلسم کو اور باہر نکل! اسم اعظم تیرے انتظار میں ہے ــــ اس کے دماغ نے آواز دی ــــ ''مخفی! کس خوابِ خرگوش میں کھوئی ہے۔ جاگ اور آنکھیں کھول! دیکھ دنیا محض خواب ہی نہیں ہے، اس کی ایک تعبیر بھی ہے!'' ــــ اس کے ضمیر نے پکارا۔ ''اے مخفی! حق یہی ہے جو مسرور پیش کرتا ہے۔ حق کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہو اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو راہِ حق کے لیے وقف کر دے۔

یہ آوازیں سن کر مخفی کے اندر کا انسان جو بے خبر اور مست پڑا سو رہا تھا، کروٹ لے کر جاگ اٹھا اور اب مخفی نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ ایک خط اس نے حلقہ حجاب کی ناظمہ کے نام لکھا۔ اپنی بیگ سے رقم نکالی، ابدال کو بلایا، خط اور رقم اس کے حوالے کر کے کچھ تاکید کی۔ ابدال سائیکل لے کر گیا اور دو گھنٹے کے اندر اس نے ناظمہ صاحبہ کا جواب اور کتابوں کا بنڈل لا کر مخفی کے حوالے کر دیا۔ خط پڑھ کر اس نے کتابوں کا بنڈل کھولا۔ پھر جس طرح ایک بھوکا کھانے پر اور پیاسا پانی پر گرتا ہے اسی طرح وہ ان کتابوں میں گم ہو گئی اور اس وقت چونکی جب عصر کو بُوا نے آ کر کہا'' بیگم صاحبہ! آپ کا انتظار کر رہی ہیں، چائے تو پی لیجیے چل کر ننھی بی!

ایک لمبی سانس لے کر مخفی نے کتابوں کو ایک طرف رکھ دیا اور چائے پینے چلی

گئی۔ اس کے بعد اس نے ان کتابوں کو بقول اپنی والدہ کے ''اوڑھنا بچھونا'' بنالیا۔

پھر اس دن، جس دن ادبی اجتماع تھا اور ٹھیک اس وقت جس وقت وہ اجتماع ہورہا تھا۔ ڈاک سے مسرور کی تقریر ایک پمفلٹ کی شکل میں اسے موصول ہوئی۔ اس نے اسی وقت تقریر پڑھنی شروع کردی۔

بھائیو! اللہ بڑا مہربان ہے۔ ہم پر اس کا عظیم احسان ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا، ضرورت کا کل سامان دیا۔ رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھایا، اس نے ہمیں علم بخشا، حکمت بخشی، کتاب بخشی، دل ودماغ عنایت فرمایا، فکرونظر مرحمت فرمائی۔

تقریر کا ابتدائیہ ہی پڑھ کر وہ جھوم گئی۔ وہ پڑھتی گئی اور جھومتی گئی۔ حروف علت کے بغیر ایسے ہی چھوٹے چھوٹے مربوط فقروں سے پوری تقریر شروع سے آخر تک آراستہ تھی اور اس میں دریا کی سی روانی پائی جاتی تھی۔ تقریر پڑھ کر اس نے قلم اٹھایا اور تقریر کی وصولیابی کی رسید سے مسرور کو اس طرح مطلع کیا:

برادرِ محترم!

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ کی تقریر ایک پمفلٹ کی شکل میں موصول ہوئی۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ اس کے انتظار میں اتنی مدّت میں نے کس طرح گزاری۔ آپ کی اس نوازش کی میں بہت ممنون ہوئی۔ میں نے آپ کی تقریر شروع سے آخر تک ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی ــــــ ماشاء اللہ آپ نے اس چھوٹے سے پمفلٹ میں معلومات کا ایک دفتر سمیٹ کر بھر دیا اور فصاحت وبلاغت کا دریا کوزے میں بند کردیا۔ آپ کی یہ تقریر پڑھ کر آپ کی پچھلی تحریروں سے اس کا مقابلہ کیا تو زمین وآسمان کا فرق نظر آیا۔ میرا خیال ہے جیسا کہ آپ نے اس سے پہلے خود تحریر فرمایا تھا۔ اس تقریر کی تیاری میں آپ کے بھائی صاحب کی اصلاح وترمیم کو بڑا دخل ہے۔ آپ کی یہ تقریر آپ کی دیگر تحریروں کے برعکس طعن وطنز سے پاک مثبت انداز میں شروع سے آخر تک چلی گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ مُسکِت جواب دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن یہ تقریر پڑھنے سے جو سکون حاصل ہوتا ہے وہ اپنا آپ جواب ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ بھائی صاحب نے آپ کی تقریر کے

سارے منفی پہلو اور تیرونشتر فقرے جیسے کتّے کو گھی اچھا نہیں لگتا، گدھے کو آم اچھے نہیں لگتے وغیرہ قلم زد فرما دیے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تقریر میں ایک بے پناہ اثر اور کشش ہے۔ اگر میرا یہ اندازہ ہے صحیح ہے تو میں آپ کو اس کامیاب تقریر پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ نہایت خوش قسمت ہیں آپ کہ آپ کو ایسے صاحب علم بزرگ کی سرپرستی حاصل ہوئی اور بڑا خوش قسمت ہوگا وہ جسے ایسے بزرگ کی سرپرستی حاصل ہو۔

والسّلام

''مخفی''

ڈاک کے وقت جب مسرورؔ اپنے بھائی مولانا منصور عالم صاحب کی خدمت میں گیا تو انہوں نے ایک کھلا ہوا لفافہ اسے دیا اور کہا۔ ''ذرا دیکھنا! خط کے آخری جملے کا کیا مطلب ہے؟'' مسرور نے لفافہ لے لیا، خط نکال کر پڑھا۔ آخری جملہ پڑھا تو وہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اسے تشویش پیدا ہوگئی کہ بھائی صاحب اس سے بدظن ہوگئے۔ وہ کچھ جواب دیے بغیر سامنے سے ہٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب کھانا کھانے گیا تو وہ ساری خط وکتابت جو مخفی سے ہوئی تھی، ساتھ لیتا گیا۔ کھاتے وقت مختصر روداد بتانے کے بعد صفائی کے طور پر بھائی کے سامنے پیش کردی۔ مولانا نے مسرور کی گھبراہٹ محسوس کرلی۔ تسلّی دیتے ہوئے بولے:۔

''مجھے تمہاری طرف سے سوءِ ظنی نہیں۔ میں نے تو اس لیے توجہ دلادی کہ کالج گرلس عموماً محتاط نہیں ہوتیں۔ میری رائے میں ان شوخ لڑکیوں کو زیادہ منہ لگانا اچھا نہیں''۔

یہ سن کر مسرور نے مزید اطمینان دلانے کے لیے کہا۔

بھائی صاحب! میں نے اپنے آخری خط میں لکھ دیا تھا کہ گفتگو پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اب اگر ضرورت ہو تو حلقہ حجاب سے مراسلت کریں۔

''ٹھیک ہے'' کہہ کر مولانا خاموش ہوگئے۔ مسرورؔ نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ جواب خط میں مخفی کو بہت ڈانٹے گا لیکن جب لکھنے بیٹھا اور مخفی کے خط پر دوبارہ نظر ڈالی تو اسے یوں مخاطب کیا۔

محترمہ بہن!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ۔ میری تقریر آپ کو پسند آئی۔ آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ بھائی صاحب نے میری تقریر میں بہت زیادہ ترمیم و تنسیخ فرمائی۔ واقعی انہوں نے جس محنت ومشقت سے مجھے پالا اس سے زیادہ محبت وشفقت سے اسلامی سانچے میں ڈھالا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اللہ کے اس احسان کا شکر ادا کرسکوں۔

محترمہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری ساری ڈاک بھائی صاحب کے ذریعے ملتی ہے۔ ایک مربی اور نگراں کی حیثیت سے انہیں حق ہے کہ میری ڈاک پر نظر رکھیں، لیکن انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ شاذ ونادر ہی میرا کوئی خط، وہ بھی جستہ جستہ دیکھ لیتے ہیں۔ اتفاقاً آپ کا یہ لفافہ انہوں نے کھول ڈالا اور خط شروع سے آخر تک پڑھ بھی لیا۔ مجھ سے دریافت فرما رہے تھے کہ خط کے آخری جملے کا کیا مطلب ہے؟ میں نے جب آپ کے خط کا آخری جملہ پڑھا اور غور کیا تو مجھے پسینہ آگیا۔ میں دن بھر بھائی صاحب سے آنکھیں چار نہ کرسکا۔ میرے خطوط سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ وہ میرے والد کی جگہ ہیں۔ میں ان کا انتہائی احترام کرتا ہوں اور ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہیں ان کی محبت کی نگاہ میری طرف سے پھر نہ جائے۔ بڑے افسوس کی بات ہے، عورت ہوکر اور پھر اب جب کہ آپ نے اسلام کا شعوری مطالعہ بھی شروع کردیا ہے۔ آپ نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ خدا کے لیے غور فرمائیے آپ کیا لکھ گئیں؟ بتائیے میں بھائی صاحب کو کیا جواب دوں؟

والسّلام

مسرور

مخفی روا روی میں یہ جملہ لکھ گئی تھی۔ لکھتے وقت اسے خیال تک نہ آیا کہ اس جملے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں؟ لیکن مسرور کا خط پاکر اب جو اس نے غور کیا تو وہ کٹ کر رہ گئی۔ شرم کے مارے اس نے مسرور کے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ رات کو سوئی تو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک پُر بہار چمن میں کھڑی ہے اور رنگا رنگ پھولوں کی مہک سے اس کی روح تازہ ہو رہی ہے۔ وہ صبح کو خوش خوش اٹھی۔ اس نے اس خواب کی خود ہی تاویل کرلی۔ چمن کو اس نے حلقۂ ''حجاب'' قرار دیا اور مہک کو اسلامی ادب سے تعبیر کیا۔

چوٹ

آج وہ کالج گئی تو اس کی دلی مسرت کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ حسبِ دستور وہ پرنسپل کے کمرے میں گئی۔ انہیں سلام کیا۔ واپس ہونے والی تھی کہ اچانک اس کی نظر اخبار پر پڑی۔ ''ارے حادثہ!'' اس نے زیر لب کہا اور اخبار اٹھالیا۔ مقامی خبروں کے کالم میں یہ سرخی پڑھی:

''ہونہار نوجوان ادیب مسرؔور کار کے حادثے میں شدید زخمی''

مخفی ایک نہایت رقیق القلب لڑکی تھی۔ پھر مسرور کو وہ اپنا محسن سمجھتی تھی۔ یہ سرخی پڑھ کر اسے بڑا قلق ہوا۔ اس نے پوری خبر پڑھی۔

''ہمارے نامہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ مسلم اوقاف کمیٹی کے صدر جناب مولانا منصور عالم کے نوجوان بھائی اور مشہور اسلامی ادیب جناب مسرؔور صاحب گزشتہ رات بعد عشاء جب کہ وہ باہر سے آئے ہوئے کچھ ادیبوں سے مل کر بائیسکل سے واپس ہو رہے تھے، اچانک ایک موٹر کار سے ٹکرا کر دور جا گرے۔ وہ گرتے ہی بے ہوش ہوگئے۔ انہیں اسی حالت میں صدر ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق ان کے سر میں شدید چوٹ آئی ہے۔ اس چوٹ سے ان کا دماغ بُری طرح متاثر ہوا۔ ہمارے نامہ نگار نے یہ بھی بتایا کہ صدر ہسپتال میں انہیں پرائیوٹ وارڈ میں جگہ دی گئی۔ ہسپتال کا اسٹاف پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہے۔ لیکن بارہ بجے رات تک ادیب صاحب کو ہوش نہ آسکا۔ شہر کے باخبر افراد جوق در جوق مولانا منصور عالم صاحب کے پاس عیادت کو جا رہے ہیں۔ ادارۂ ''صبح صادق'' بھی اس غم میں

مولانا کا شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ادیب صاحب کو جلد شفا عطا فرمائے۔ ادیب صاحب نے اتوار کو ''رفاہ عام'' میں جو تقریر فرمائی تھی اسے ہم بڑے فخر کے ساتھ ''صبح صادق'' کی اسی اشاعت میں شائع کر رہے ہیں''۔

اس خبر کا اثر مخفی پر کیا ہوا؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ ضبط کے آداب سے واقف تھی، نہایت خود دار اور غیور تھی۔ پرنسپل صاحب کے سامنے اپنے تاثرات چھپا لینے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہوگئی۔ وہ فوراً کلاس میں چلی گئی۔ جیسے تیسے کالج کا وقت گزرا۔ چھٹی ہوتے ہی سیدھی گھر پہنچی۔ ماں نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پاس بلالیا۔ حال پوچھا تو اس نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے ٹال دیا، چائے پی کر ماں کے ساتھ گھر کے کام کاج میں لگ گئی اور اس طرح اپنا دل بہلانے کی ناکام کوششیں کرنے لگی۔ بعد مغرب اس کے والد قاضی یوسف حسین صاحب تشریف لائے۔ بیٹی نے باپ کو سلام کر کے حسب معمول دسترخوان بچھایا۔ سب کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ مخفی کی والدہ نے دیکھا کہ میاں کچھ شوق سے کھانا نہیں کھا رہے ہیں تو بولیں۔ ''کیوں، کھاتے کیوں نہیں؟

قاضی صاحب نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''آج شہر میں بڑا افسوسناک حادثہ ہوگیا ـــــــ'' ''اللہ خیر کیا ہوا؟'' کہتے ہوئے بیوی نے تفصیل پوچھی۔ قاضی صاحب نے بتایا ''وہ جو ہمارے دوست مولانا منصور عالم صاحب ہیں نا! وہ کیا جمعہ کو تشریف لائے تھے۔ ان کا نوجوان بھائی مسرؔور بُری طرح کار سے زخمی ہوگیا۔ بے چارے مولانا اور ان کے گھر کے لوگ رات سے بدحواس ہیں۔ میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔

اللہ خیر، آج کل کے لڑکے راستہ دیکھ کر بھی تو نہیں چلتے۔

''نہیں بیگم! یہ بات مسرؔور کے لیے صحیح نہیں۔ تم جانتی نہیں۔ مولانا نے اسے بڑی اچھی تربیت دی۔ وہ بڑا نیک بچہ ہے''۔

''تو پھر موٹر والے نے جان کر ٹکرا دیا؟''

''بالکل قصداً تو ہوا ہی۔ محض شرارت!

''تو کچھ دشمنی رہی ہوگی؟''

''لیکن یہ دشمنی بھی یک طرفہ ہی تھی''۔

''توبہ! میرے اللہ! یہ یک طرفہ دشمنی کیسی؟''

''کیا بتاؤں کیسی؟ تم جانتی ہو میں سیلانی آدمی۔ شہر میں کوئی بات ہو اور مجھے معلوم نہ ہو۔ غیر ممکن ہے۔ کوئی محترمہ ہیں مخفی صاحبہ، بس کی گانٹھ، انہی صاحبہ کے کارن یہ حادثہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہترین ذہن و علم عطا فرمایا۔ ہماری بیٹی کی طرح اردو عربی میں ایم۔ اے بھی ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جس مالک نے بی صاحبہ کو ذہن و علم سے سرفراز فرمایا۔ زورِ قلم سے نوازا اسی کو خوش کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتیں مگر معلوم ہوتا ہے گھر کا ماحول اچھا نہیں، ماں باپ نے ٹھیک سے تربیت نہیں کی۔ شاید لڑکی بگڑ گئی۔ اس احمق نے ایک نہایت نامعقول افسانہ لکھ مارا۔ افسانہ ماہ نامہ ''نشاط'' میں چھپا۔'' اربابِ نشاط'' اوباش تو ہیں ہی، وہ تو ایسی تیتریوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بس لے اڑے اُسے۔ تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ اس افسانے کا اثر شریف بہو بیٹیوں پر پڑتے دیکھا تو مولانا نے مسرور کو اشارہ کر دیا۔ تو بس تم جانو، جیسے شیر کچھار سے نکل آیا۔ ویسے تو وہ بڑا بھولا نظر آتا ہے مگر میدانِ ادب میں اس کے تیور دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے جیسے رستم سویّوں کو للکار رہا ہے۔ اس نے قلم اٹھایا تو دھجیاں اڑا کے رکھ دیں۔ اس دن سے بی مخفی صاحبہ کو تو سانپ سونگھ گیا، رہے ''اربابِ نشاط'' تو ان سے تک کا جواب تو سوجھا نہیں۔ اس طرح شرارت کر کے منہ بند کرنا چاہتے ہیں۔ کیا بتاؤں، مولانا سے لاکھ کہا مگر اس بندۂ خدا نے ہاں نہ کی ورنہ ایک ایک کی نشان دہی کر کے جیلوں میں سڑوا دیتا۔ مولانا کہتے ہیں اس طرح دشمنی بڑھے گی اور اصلاح کے راستے بند ہو جائیں گے مجھے تو مولانا کی اس نیکی پر غصہ آتا ہے۔ انہی کا سایہ مسرور پر پڑا ہے۔

''اور کیا عمر ہے غریب کی؟

''یہی پچیس چھبیس برس کا ہوگا۔

''اُف اللہ! غریب بیوی کا دل کیا کہتا ہوگا؟''

''اس کی بیوی کہاں؟ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی!

''اللہ خیر، اللہ خیر! مولانا اپنے بھائی کے سر سہرا دیکھیں۔

”آمین! بھئی سب دعا کرو۔ مولانا مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔

”تو کیا حال ہے اس بے چارے کا؟

”ایسی چوٹ آئی اس غریب کو کہ رات بھر ہوش نہ آیا اسے۔ ڈاکٹروں نے بڑی کوششیں کیں۔ اللہ کے فضل سے فجر کے وقت ہوش آیا۔ کیا بتاؤں بیگم! چشم بد دور، بڑا صالح اور مسلمان نوجوان ہے۔ کہتے ہیں کہ بیہوشی میں بھی خدا اور رسولؐ کی باتیں اس کی زبان سے نکل رہی تھیں۔

قاضی صاحب کی ان باتوں نے گھر کی فضا غم آگیں بنادی۔ باپ کی زبان سے رو در رو اپنے متعلق یہ سُن کر مخفی کا بُرا حال ہوگیا۔ ان کلمات کو اس نے اپنے منہ پر ایک زبردست طمانچہ محسوس کیا اور اس حادثے کی ذمہ دار اپنے کو قرار دیا۔ اب اسے احساس ہورہا تھا جیسے اس نے خود ہی مسرور پر موٹر کا پہیہ پھیر دیا۔ وہ اسے اپنا محسن سمجھتی تھی۔ ایسا محسن جو اندھیرے سے گویا ہاتھ پکڑ کر اسے اجالے میں لے آیا ہو۔ باپ کی زبان سے حقیقتِ حال جان کر چیخ پڑنے کو اس کا جی چاہتا تھا مگر اس نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو روکا۔ وہ چاہتی تھی سب جلد کھانے سے فارغ ہوجائیں اور اسے تنہائی نصیب ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ اس کوفت سے اس کا دماغ متاثر ہوجائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مخفی کے والد نے کچھ یونہی کھایا اور واردات ہی بیان کرتے رہے۔ باپ کی دیکھا دیکھی اسے بھی موقع مل گیا۔ اس نے بھی دو چار لقمے زہر مار کر کے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ دیکھ کر اس کی والدہ نے بوا سے کھانا لے جانے کو کہا۔ کھانا کھا کر قاضی صاحب اٹھے ہی تھے کہ مخفی اپنے کمرے میں جا کر شدّتِ غم سے پلنگ پر گر پڑی۔ اور منہ لپیٹ کر پڑ رہی اس کی بوا بڑی موقع شناس تھیں۔ وہ آکر مخفی کے پائینتی بیٹھ گئیں اور گھر کی فضا دیکھ کر مسرور کے لیے کلماتِ خیر کہنے لگیں۔

ہے ہے بی بی! اللہ قسم۔ کیا برا زمانہ آن لگا ہے۔ آئے دن ایک نہ ایک بُری خبر سننے میں آتی ہی رہتی ہے۔ ہائے بے چارہ مسرور، اللہ قسم بی بی! بڑا بھولا بھولا اور سعید لڑکا ہے۔ ایسا نیک اور شریف کہ دیکھتے ہی مردوں کی طرح ـــــ ”السلام علیکم“ کہتا ہے!

بُوا کی یہ باتیں بالکل بے تکی قسم کی تھیں مگر انہی باتوں سے مخفی پر کچھ ایسا اثر ہوا

جسے غم غلط ہونے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ رونے سے بھی اس کے دل کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ اس نے کہا:

"بوا، وہ مردوں کی طرح نہیں تو کیا عورتوں کی طرح سلام کرے؟ کیا وہ عورت ہے؟

"نہیں بی بی! میرا مطلب یہ نہیں، جیسے ہم کہتے نا! بوا سلام، خالہ سلام، پھوپھی سلام، وہ اس طرح نہیں کہتا۔ چاہے مرد ہو، چاہے عورت، سب کو وہی مردوں کی طرح "السَّلامُ علیکم، السَّلامُ علیکم! یہ میں کہتی ہوں، اللہ قسم بی بی! اسے دنیا کی ہوا چھو بھی نہیں گئی۔ سنا ہے کہ مولانا صاحب نے اولاد کی طرح اسے پالا۔ اور بی بی بتاؤں۔ محبت ایسی اور نہ جانے کیوں کالج والج میں اسے نہیں پڑھوایا۔ اللہ قسم، وہ تمہاری طرح پڑھتا تو بڑا قابل نکلتا۔"

تو کیا اب وہ بے وقوف ہے؟ بوا چھوڑو اس کی باتیں، تمہیں کاہے کو اس کی محبت پھٹ پڑی؟"

"اللہ قسم بی بی! وہ بے وقوف اب بھی نہیں۔ سنا ہے باتوں میں بڑے بڑے بالسٹروں کو مات کرتا ہے۔ میں تو یہ کہتی ہوں۔ مولانا صاحب اُسے اس اسکول میں پڑھواتے جس میں مونچھ منڈے لونڈے بائیسکل سے پڑھنے جاتے ہیں تو وہ اللہ قسم ایسی انگریزی بولتا کہ تم اِتّا پڑھ گئی ہو پَر اس کی گٹ پٹ نہ سمجھ پاتیں"۔

مخفی بوا کی باتیں سن کر مسکرادی۔ بولی: "تو اتنا پڑھ جاتا بوا اور اب کیا وہ پڑھا لکھا نہیں؟"

"پڑھا لکھا تو وہ اب بھی ہے۔ پر ایسے پڑھنے سے کیا حاصل؟ تمہاری طرح پیے دِیے کرتا تو آج کہیں ڈپٹی ہوتا۔ اللہ قسم، ڈھیروں روپیہ لاتا ہر مہینے، اور بی بی تنخواہ تو آج کل الگ رہی۔ ڈپٹی لوگوں کے ٹھاٹ تو اوپر کی آمدنی سے ہوتے ہیں۔ مگر بی بی! تم مانو یا نہ مانو۔ مسرور ڈپٹی بھی ہوتا تو رشوت کبھی نہ لیتا۔ اللہ قسم مولانا سے بہت ڈرتا ہے۔ وہ بھلا حرام مال گھر میں کب لانے دیتے؟

"شاید اسی لیے نہ پڑھایا ہو اسے بائیسکلوں والے اسکول میں!" مخفی پھر مسکرائی۔ بوا نے ایک پان منہ میں رکھتے ہوئے کہا:۔

''ٹھیک کہا بی بی تم نے! اللہ قسم پڑھے لکھوں کی چار آنکھیں جو ہوتی ہیں۔ پر کیا کہوں بی بی! میں جب مسرور کو دیکھتی ہوں تو کیا کہتے ہیں، اللہ قسم! وہ کیا کہتے ہیں، اللہ قسم''۔

اللہ قسم، اللہ قسم کہتے کہتے بوا ہکلانے لگیں۔ مخفی نے پوچھا۔''اللہ قسم کی بوا! ہاں، تو پھر کیا کہتے کہتے ہکلانے لگیں تم؟ اب بوا نے بات ٹالی۔ بولیں۔ اللہ قسم! بڑا ترس لگتا ہے۔ اللہ میاں اسے اچھا کر کے مولانا صاحب کے دل کو ٹھنڈک پہنچائیں۔ بے چارے میاں بیوی اور بال بچے سب کے سب پریشان ہیں۔

مخفی کا دل بھر آیا۔ بوا بولتی چلی گئیں''بی بی! اللہ قسم! رات سے نہ کوئی سویا، نہ کسی نے کچھ کھایا۔ میں پان لینے چوراہے پر گئی تھی تو کریمن ملی کہتی تھی۔ مولانا کے گھر میں (میرے منہ میں خاک) کیا کہوں، اللہ قسم! درو دیوار سے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی......''

''اچھا چپ ہو جاؤ بُوا! کیوں کسی غریب کے لیے بُری بات زبان سے نکالو''۔

توبہ توبہ! اللہ قسم بی بی! تم تو جانتی ہو، ہم جاہل لوگ۔ بات کرنا کیا جانیں؟ جو منہ میں آیا بک دیا۔ پر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ ایسا نیک اور معصوم لڑکا میں نے نہیں دیکھا۔ کیا بتاؤں، اس کے پاس بھی تمہاری طرح سائٹیفکٹ ہوتے تو......؟

''تو اس کے سائٹیفکٹ کو تم کیا کرتیں بوا؟'' مخفی نے تیز نگاہوں سے بوا کو دیکھا۔

ابھی بوا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مخفی کی والدہ نے اپنے کمرہ سے پکارا۔

بُوا، آج جاؤ گی نہیں؟''

یہ سن کر بوا اٹھیں اور چادر سنبھالتی اپنے گھر چلی گئیں۔ مخفی نے صدر دروازے میں قفل ڈالا اور پھر آ کر اپنے پلنگ پر پڑ گئی۔ معلوم نہیں، اسے نیند آئی کہ نہیں۔ دوسرے دن وہ کالج گئی۔ وہاں اس کا جی نہ لگا۔ دو دن کی چھٹی لے کر چلی آئی۔ گھر آ کر بھی وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ آج اس نے ظہر کے وقت نماز بھی پڑھی اور دیر تک نہ جانے کیا دعائیں مانگتی رہی۔ اس کی والدہ نے یہ تبدیلی دیکھی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ ماں کے پاس آئی اور ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ اب تو ماں کو خوشی کے ساتھ تعجب بھی ہوا۔ پوچھا۔

''بیٹی! آج کالج نہیں گئیں تم؟ بولی۔ ''میں نے کالج سے دو دن کی چھٹّی لے لی ہے''۔ شام کو جب قاضی صاحب آئے تو بیوی نے میاں سے بیٹی کی سعادت مندی کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی بہت دعائیں دیں۔ دو دن کی چھٹی ختم ہونے کے بعد وہ کالج گئی۔ کالج جا کر اس نے ایک ہفتے کی چھٹی اور بڑھوالی۔ پھر وہیں سے سیدھی ہسپتال گئی۔ ہسپتال میں ایک نرس سے کچھ پوچھا۔ اس نے جنرل وارڈ سے ملے ہوئے پرائیویٹ وارڈ کی طرف اشارہ کردیا۔ مخفی اسی طرح چل پڑی۔ پرائیویٹ وارڈ کے دروازے پر چک پڑی تھی۔ اس نے قریب جا کر پہلے اندر کا جائزہ لیا۔ اندر ایک نرس بیٹھی ہوئی دو ابنا رہی تھی۔ مریض پڑا سو رہا تھا۔ مخفی کی آہٹ پا کر نرس دبے پاؤں باہر آئی۔ دھیرے دھیرے دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد مخفی نرس کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اندر پہنچ کر پلنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اپنے محسن کو غور سے دیکھنے لگی۔ سر کے سوا مریض کا پورا جسم ایک کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ ڈھکے ہوئے جسم کے زخموں کی مرہم پٹّی کا اندازہ وہ نہ لگا سکی۔ البتہ سر میں بندھی ہوئی پٹیوں کو دیکھ کر اس کا جذبۂ ہمدردی دل کی انتہائی گہرائیوں سے اُبھرا۔ رقیق القلب تو وہ تھی ہی، اپنے محسن کو اس حال میں دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے مسؔرور کو دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ ایک کراہ کے ساتھ جاگ گیا۔ اس کی نظر مخفی پر پڑی۔ یہ دیکھتے ہی مخفی نے برقع کا نقاب کھینچ لیا۔ پیچھے ہٹی اور کسی کو کمرے کی طرف آتا دیکھ کر جھٹ باہر نکل گئی۔ اتفاق کی بات عین اسی وقت مولانا منصور عالم صاحب چک اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ ایک برقع پوش کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر مسؔرور سے پوچھا۔ ''یہ کون تھیں؟'' وہ کچھ نہ بتا سکا۔

اس کے تیسرے دن وہ پھر گئی لیکن اس ڈرامائی انداز سے اسے پھر واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد جمعہ کو گئی تو وارڈ خالی پایا۔ نرس سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج دس بجے مولانا مریض کو اصرار کر کے لے گئے۔ مخفی نے مریض کی حالت پوچھی۔ اس نے بتایا۔

''ویسے تو مریض رو بصحت تھا لیکن دماغ ہنوز کمزور ہے۔ تین چار دن سے سوتے میں بڑبڑایا کرتا تھا۔

آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں پہچانتا۔ شاید آپ دور کی رشتہ دار ہیں۔''

نرس کی زبان سے یہ کلمات سن کر مخفی کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے دل سے ہمک کر اٹھتی ہے اور حلق میں آ کر اٹک جاتی ہے۔ اس نے نرس سے پھر کچھ نہ پوچھا۔ چپکی واپس چلی آئی۔ گھر آ کر اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز میں اسے ایک عجیب کیفیت حاصل ہوئی۔ اب وہ محسوس کرتی تھی کہ نماز اس کے لیے سکون قلب کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ جب وہ زیادہ پریشان ہوتی تو اپنے رب کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوجاتی اور نماز میں نہ جانے کتنے لمبے لمبے رکوع اور سجدے کرتی۔ اس کی نمازوں میں حضوری کی کیفیت بڑھ گئی۔ ماں باپ بیٹی کی یہ عبادت گزاری دیکھتے تو خوش ہوتے اور مزید توفیق کی دعا دیتے۔

ایک جمعہ کو وہ ظہر کی نماز پڑھ کر سورۂ یوسف تلاوت کر رہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ وہ پڑھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ رو رہی تھی اور پڑھ رہی تھی۔ اسی حالت میں اسے وہ فقرہ بھی یاد آیا جو اس نے مسرورؔ کو رواروی میں لکھ دیا تھا۔ اور مسرورؔ کے پوچھنے پر اس کے معنی نہ بتا سکی تھی۔ اسی حالت میں باپ کے وہ کلمات یاد آئے جو موٹر کے حادثے کی خبر سناتے ہوئے انہوں نے کہے تھے اور وہ کلمات مخفیؔ کے منہ پر طمانچہ بن کر لگے تھے۔ اسی حالت میں اسے بوا کی بے تکی لیکن غم غلط کرنے والی باتیں بھی یاد آئیں۔ اسی حالت میں مسرور کے وہ فقرے کانوں میں گونجے جو نرس سے سن کر آئی تھی۔ سورہ یوسفؔ کی تلاوت میں یہ باتیں یاد آئیں تو اس کی رقت میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے اسی حالتِ گریہ میں بے اختیار ہاتھ اٹھا دیے۔ دیر تک کچھ دعائیں کرتی اور آنسو بہاتی رہی وہ دعائیں مانگ ہی رہی تھی کہ اس کے والد صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آ کر بیوی کو بتایا۔ ''آج مسرورؔ نے غسل صحت کیا''۔ باپ کی آواز بیٹی کے کانوں میں پہنچی۔ اس پر مایوسی میں مراد پالینے والے انسان کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ دلی کیفیت کو چھپائے ہوئے باپ کے پاس آئی، سلام کیا اور ادب سے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ باپ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بڑی شفقت سے پوچھا:

''بیٹی! کالج جانا کیوں چھوڑ دیا تم نے؟'' مخفی نے باپ کو بھی وہی جواب دیا جو اس نے ماں سے عرض کیا تھا۔ مزید یہ بھی کہا:

''ابا جان! اب میں ملازمت سے استعفادے دوں گی اور اس کے بدلے دن رات آپ کی اور امّی جان کی خدمت کیا کروں گی۔''

ایک باپ کے لیے اور باپ بھی کیسا؟ قاضی یوسف حسین صاحب جیسا۔ اس سے زیادہ اور کیا خوشی ہوسکتی تھی۔ وہ بیٹی کے انقلاب ذہنیت کا سبب تو نہ سمجھے۔ دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دیر تک دعائیں دیتے اور نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد رات کو جب سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچے تو مخفی نے مسرور کو اس کی صحت یابی پر اس طرح مبارک باد پیش کی۔

محترمی!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اس پاک بے نیاز کا کس زبان سے شکر ادا کروں جس نے اپنے فضل وکرم سے آپ کو دوبارہ زندگی بخشی۔ میں اس حادثے کو یاد کرتی ہوں تو اب بھی میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ اُف اللہ ــــ! خیال کرتی ہوں تو رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیا حالت ہوئی ہوگی آپ کی، جب آپ موٹر سے ٹکرائے ہوں گے۔ میں نے جس وقت یہ خبر اخبار میں پڑھی تو کچھ عرض نہیں کرسکتی، کیا حالت ہوئی تھی میری! میں اپنی جگہ تڑپ گئی۔ میں تین بار آپ کی عیادت کے لیے اسپتال گئی، لیکن کچھ اس طرح واپس ہونا پڑا جسے دہرانا میں کچھ اچھا نہیں سمجھتی۔ آپ کی وہ زرد صورت میری نظروں میں اب تک پھر رہی ہے جو اسپتال میں میں نے دیکھی تھی۔ آپ بے حس وحرکت پلنگ پر پڑے تھے۔ اتفاق کی بات دو بار جب میں آپ کی عیادت کو گئی تو آپ کے بھائی صاحب اچانک آگئے۔ تیسری بار جمعہ کو گئی تو آپ کو وہاں نہ پایا۔ نرس سے آپ کا حال پوچھا۔ اس نے پوری کیفیت بتائی۔ معلوم کر کے دلی صدمہ ہوا۔ نرس نے آپ کے وہ جملے بھی میرے سامنے دہرائے جو دماغی کمزوری کی وجہ سے سوتے میں آپ کی زبان سے نکل جایا کرتے تھے۔ مجھے ایسا احساس

ہو رہا ہے کہ ان جملوں کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے لیے آپ سے کس طرح معافی مانگوں؟ اسپتال میں آپ کی بے کسی دیکھ کر میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی؟ میں یہ کسی طرح نہیں لکھ سکتی۔ پھر بھی اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مجھے اس نرس پر رشک آیا، جسے میں نے ہیٹر پر آپ کے لیے پانی گرم کرتے دیکھا تھا۔ کاش کہ اس کی جگہ میں ہوتی۔

میں بڑے خلوص کے ساتھ آپ کو آپ کی صحت یابی کی مبارک باد پیش کرتی ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی گزارش کرتی ہوں کہ آپ نے اب تک مجھ پر جو شفقت فرمائی، اس سے آئندہ محروم نہ رکھیں۔ آپ میرے خط کا جواب ضرور دیں۔ میں نے حسب ارشاد حلقہ 'حجاب' کی خواتین سے رابطہ قائم کرلیا۔ ان سے میری خط و کتابت جاری ہے۔ واقعی آپ نے جیسا ان کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ ویسا ہی انہیں پایا۔ میں نے مکتبہ حجاب سے وہ سارا لٹریچر منگا کر پڑھ ڈالا جس کی آپ نے نشان دہی کی تھی۔ راستہ تو آپ نے دکھادیا تھا، چلنا ان کتابوں سے سیکھا، لیکن آپ ہنوز مجھے اس راہ کا ایسا ہی راہی سمجھیں جو کسی راہبر کے قدم بہ قدم ہی چل سکتا ہے۔ ''حجاب'' کے کسی شمارے میں ایک شعر نظر سے گزرا تھا۔ شعر میں تحریف مقصود نہیں، اپنے حسب حال پا کر صرف شاعر کے تخلص کی جگہ اپنا نام لے کر عرض کرتی ہوں ۔

کتنی آسان تھی بے راہ روی اے مخفی
راہ پر آئے تو چلنا ہمیں دشوار ہوا

میرے محسن! یہ شعر میری حالت کا آئینہ دار ہے۔ اگر آپ نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو یقین جانیے، یہ ناتواں اور کمزور بیچ راستے میں تھک کر گر پڑے گی۔ جی تو چاہتا ہے بس لکھتی چلی جاؤں۔ دل میں نہ جانے کیا کچھ ہے۔ مگر زیادہ کہنے سے فائدہ؟ میں پھر آپ کو صحت یابی کی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ خدا جانتا ہے میں نے آپ کے لیے کیا کیا دعائیں کیں۔

والسّلام ....آپ کی............مخفی

ڈاک مولانا کے ہاتھ میں پہنچی تو انہوں نے یہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

دوسرے خطوط دیکھ کر اٹھے، گھر میں گئے۔ تخلیے میں بیوی سے کچھ باتیں کیں۔ اس کے بعد مسرورؔ کو وہیں بلا بھیجا۔ وہ اس غیر متوقع طلبی سے گھبرا سا گیا۔ وہ گیا اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ مولانا نے جیب سے لفافہ نکالا۔ لفافے کو ایک بار الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مسرورؔ کی نظر لفافے پر پڑی، اس نے پہچانا، اس کا دل کانپ گیا۔ مولانا نے فرمایا:۔

''مسرورؔ! میں نے یہ لفافہ کھولا نہیں، لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس لفافے میں جو خط ہے اس میں وہ کچھ لکھا ہے جسے تم مجھ کو نہ دکھا سکتے ہو اور نہ سنا سکتے ہو۔ میں نے اس سے پہلے تمہارے ہی بھلے کے لیے نصیحت کی تھی کہ اس لڑکی کو منہ نہ لگاؤ۔ تم نہ مانے۔ بعض مشاہدات کی بنا پر میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ یہ لڑکی بے طرح تمہارے پیچھے پڑگئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ ہے جو ہر دوسرے تیسرے دن تمہاری عیادت کو اسپتال جاتی رہی۔ میں نے تم سے پوچھا۔ تم کچھ بتا نہ سکے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی طرف مائل ہو۔ سوتے میں تمہاری بڑ بڑاہٹ اس کا ثبوت ہے۔ اگر میں وہاں سے تم کو نہ لے آتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ڈرامہ کیا صورت اختیار کرتا۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ ہر شخص کو اپنی شریک حیات اپنے حسب منشاء تلاش کرنے کا حق ہے۔ اسلام میں اس کی اجازت بھی ہے۔ میں تمہارے ارادوں میں روڑا نہ بنوں گا لیکن مجھے تم سے جو محبت ہے اس کا تقاضا ہے کہ میں تم کو تباہی کے راستے سے آگاہ کر دوں اور حتی الامکان روکوں بھی۔ یہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ عقل مند وہ ہے جو کسی بچے کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھے تو اسے پکڑ لے۔ چاہے وہ بچہ روئے، پیٹے، چلائے، چیخے۔ اس بچے کے رونے اور ضد کرنے سے کوئی دانا انسان اس کی نادانی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ بشرطیکہ اس سے محبت ہو۔ پھر تمہارے مقابلے میں میرا جو علم اور تجربہ ہے اس کے تحت تمہاری نوجوانی کے تصوّرات اور ناتجربہ کاریوں پر ٹوکنا ضروری بھی سمجھتا ہوں۔ تمہاری سعادت مندی سے توقّع ہے کہ اپنی زندگی بنانے کے لیے مجھ سے اور اپنی بھابی اماں سے ضروری معاملات میں رائے لیتے رہوگے پھر یہ معاملہ جس کا تعلق ساری زندگی سے ہے۔ اسے تو خوب جانچ اور پرکھ لینا چاہیے۔ یاد رکھیے، جذبات کی رو

میں بہنے والا اندھے کی طرح ٹھوکریں کھاتا ہے۔ تمہارا دل اقرار کرتا ہوگا کہ ہم دونوں تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ آگے تمہاری مرضی۔ میری اسی گفتگو کے بعد اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے کہ تم اپنے لیے مخفی ہی کو پسند کرتے ہو تو میں تمہاری اس خواہش کو کچلنا بھی نہیں چاہتا۔ لو، اب یہ لفافہ لو، خط نکالو، پڑھو اور مجھے بتاؤ کیا واقعی تم اسی مخفی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ یا پھر ہم دونوں کی طرف سے تمہارے دل میں جو گنجائش اور احترام ہے اسے بھی کچھ اہمیت دیتے ہو؟''

یہ کہہ کر مولانا نے لفافہ مسرور کی طرف بڑھا دیا۔ مسرور کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ بھائی کی زبان سے اس نے ایسی باتیں سنیں۔ بھائی بھی کیسا جس نے باپ بن کر اُسے پالا تھا۔ وہ اپنی بھابی اماں کو بھی ماں کے برابر سمجھتا تھا۔ وہ کوئی بت تو تھا نہیں جو اپنے پجاریوں کی خدمات کو نہ دیکھ سکتا اور نہ ان سے کچھ کہہ سکتا۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ بھائی اور بھابی نے اولاد کی طرح اسے پالا۔ اسے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی آدھی بات بھی اسے کہی ہو۔ انہوں نے جو تعلیم و تربیت دی اس کے نتائج بھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھے، گو وہ علم میں ہنوز پختہ تو نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی بڑے بڑوں کی نگاہوں سے نگاہیں ملا کر اپنی بات منوانے کا دم داعیہ رکھتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے اپنے ان مجازی ماں باپ سے آنکھ ملا کر کبھی بات کی ہو۔ غیرت دار تو وہ تھا ہی۔ بھائی کی باتوں سے اس کے دل پر چوٹ پڑی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

عجیب درد انگیز عالم تھا۔ مسرور کی بھابی اماں اس کے ساتھ ہی آنسو بہانے لگی تھیں۔ لفافہ بند کا بند مولانا اور مسرور کے درمیان پڑا تھا۔ مولانا نہایت متین اور بزرگ آدمی تھے۔ ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ لیکن چہرے کی یہ حالت تھی کہ ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ دس پندرہ منٹ یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد مولانا یہ کہتے ہوئے اٹھے:۔

''مسرور! مجھے آج ہی جواب ملنا چاہیے''۔ اور باہری کمرے میں جا بیٹھے ان کے جانے کے بعد اسے موقع ملا۔ بھابی اماں کے سامنے وہ خوب رویا۔ اس کی بھابی اماں نے اسے تسلّی دی۔

''بیٹے! اس میں بات ہی کیا ہے؟ جو دل میں ہو کہہ دو۔ ہم تمہارا دل میلا نہ کریں گے۔''

بھابی اماں کی باتوں سے مسرور کا دل کچھ ٹھیرا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ جیب سے قلم نکالا۔ لفافے کو اٹھایا۔ بغیر کھولے اس کی پشت پر لکھ دیا:
مخفی سے مجھے ادبی خط وکتابت کے علاوہ کوئی دل چسپی کبھی نہیں ہوئی اور نہ اس سے زیادہ میں اسے جانتا ہوں اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ اس سے شادی کرنے کا خیال میرے دل میں نہ کبھی آیا نہ اب ہے اور نہ آئندہ ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد آپ میری زندگی کے محافظ اور نگراں ہیں''۔

یہ لکھ کر لفافہ بند کا بند بھابی اماں کو دے دیا اور مغموم وغمگین اپنے کمرے میں جاکر پڑرہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی طلبی پھر ہوئی۔ وہ گیا، دیکھا کہ بھائی صاحب اور بھابی اماں تشریف فرما ہیں۔ وہ جاکر کھڑا ہوگیا۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔ بڑی محبت اور شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرا! بولے:۔
''مسرور! تم نہایت سعید بھائی اور صالح نوجوان ہو''۔ اس کے بعد مولانا بیوی سے مخاطب ہوئے۔

اچھا تو صبیحہ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

میں نے اسے ایک بار سیّد صاحب کے یہاں دیکھا۔ بے عیب ذات خدا کی ہے۔ میں تو اسے ہزاروں میں ایک لڑکی سمجھتی ہوں۔ بس ایک بات سے ذرا جھجکتی ہوں۔''

''وہ کیا؟ میں نے تو سنا ہے بڑی دیندار لڑکی ہے۔''

''وہ بھی ایم، اے اور نہ جانے کیا کیا ہے؟''

''اسی لیے تو میں اور بھی اسے پسند کرتا ہوں۔ پہلے میرا بھی خیال اس کی طرف نہ تھا لیکن اب مسرور کے لیے مخفی سے کم علم لڑکی میں نہیں چاہتا۔''

''تو پھر نیک کام میں دیر کاہے کی؟''

کچھ نہیں، تم بتاؤ کھکھیڑ تو ساری تم ہی کو کرنی ہوگی۔ میں تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔

اس مختصر بات چیت کے بعد سب اٹھ گئے۔ مسرور بھائی کے حکم سے بیٹھا باتیں سنتا رہا لیکن اسے کوئی دل چسپی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں اسے بولنا نہیں چاہیے۔ پھر وہ انتہائی شرمیلا اور حیادار بھی تھا۔ اسے اس معاملے میں بولنے کی ہمت ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ تو بس یہ سمجھ کر بیٹھا باتیں سنتا رہا کہ بھائی صاحب کو یہ باتیں اسے سنانی تھیں۔ اس نے سب کچھ سن لیا۔ عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کر وہ دارالمطالعہ گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر آیا۔ کھانا کھایا۔ اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے بستر پر جا لیٹا۔ مخفی کے لفافے کا خیال آیا لیکن اس نے اسے قصداً نہیں کھولا۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ دن بھر کی باتیں ایک ایک کرکے اسے یاد آرہی تھیں۔ مخفی کا خط ایک طرف چٹکیاں لے رہا تھا۔ صبیحہ کا بھی خیال اسے آیا۔ آج پہلے پہل اس کی اپنی شادی اسے دعوت فکر دے رہی تھی۔ ہر خیال کا مطالبہ تھا کہ اس کے متعلق کچھ نہ کچھ سوچے۔ مگر ہر طرف سے توجہ ہٹا کر وہ سو جانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں، ان تصوّرات نے اسے کب سونے کا موقع دیا۔

صبیحہ

دوسرے دن بھی یہ تمام خیالات اسے گھیرے رہے۔ ان سے چھٹکارے کی صورت اسے یہ نظر آئی کہ وہ یا تو مخفی کے خط کو بغیر پڑھے پھاڑ ڈالے یا پھر اسے پڑھ کر آخری تنبیہ کردے اور ہمیشہ کے لیے اسے بھول جائے اس نے سوچا پہلی صورت میں ایک خلش یہ رہے گی کہ نہ معلوم مخفی نے خط میں کیا لکھا ہے اور نہ جانے وہ اب کس طرح سوچ رہی ہے؟ دوسری صورت میں وہ آداب مراسلت کی اخلاقی ذمّہ داری سے سبک دوش ہوجائے گا اور دوٹوک اور آخری بات بھی کرسکتا ہے۔ اس نے دوسری صورت پر عمل کیا۔ مخفی کا لفافہ جیب سے نکالا۔ پہلے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ پر رکھ کر تولا۔ وہ اپنی اس حرکت پر مسکرایا۔ اس کے بعد لفافہ کھولا۔ خط نکالا۔ تحریرِ خط پر نظر پڑی تو اس کے دل میں ایک لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے خط پڑھنا شروع کردیا۔ خط پڑھ کر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ خط سراسر اسے محبت وخلوص نظر آیا، اب اسے خیال آیا کاش کہ پہلے یہ خط پڑھ لیا ہوتا۔ اس کے بعد اپنی شادی کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا۔ بھائی صاحب سے کہہ دینے میں ہرج ہی کیا تھا۔ وہ ضرور میرے جذبات کا لحاظ فرماتے۔ بنے بنائے ذہن ومزاج کی لڑکی رفیقۂ حیات بنتی۔ صبیحہ کو ہم مزاج بنانے میں ایک عرصہ لگے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وہ ویسی نہ بن سکے جیسی چاہیے۔ یہ سب تو اللہ کی توفیق پر ہے۔''

مسرور یہاں تک سوچ سکا تھا کہ معاً اس کی دماغی قوتوں نے اسے پکارا۔ ''مسرور! جب ایک گمراہ مخفی کو اللہ کے فضل سے راہ راست پر لے آیا تو بیوی پھر بیوی ہے، اس کا انفعالی جذبہ خود معاون بنے گا۔ جب ایک غیر لڑکی کو اپنی راہ پر لگالیا تو بیوی کو

اپنی راہ پر لانا کیا مشکل ہے۔ خدا پر بھروسہ چاہیے! ــــــ دماغی قوتوں کی اس پکار سے مسرور چونکا۔ اس نے مخفی کے خیال کو وسوسہ تصوّر کیا لیکن اب یہ سوال پیدا ہوا کہ مخفی کا کیا بنے گا؟ اگر اس کی شادی خدانخواستہ کسی غلط شخص سے ہوگئی تو میری ساری محنت اکارت جائے گی۔ مسرور سے اس سوال کا جواب بن نہ آیا۔ وہ دیر تک سوچتا رہا، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دل بہلانے کے لیے اپنے ''یارانِ طریقت'' سے ملنے چلا گیا۔ عشاء کے بعد جب ساری دنیا نیند کے مزے لوٹنے چلی تو اس نے خیال کیا کہ مخفی کے خط کا جواب ضرور جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے مخفی کو اس طرح مخاطب کیا:

بہن!

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط ملا۔ میں آپ کے خلوص کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے خلوص کا اجر آپ کو عطا فرمائے گا۔ براہِ کرم ایسے جذباتی خطوط آپ مجھے ہرگز نہ لکھا کریں۔ آپ میرے لیے نامحرم ہیں۔ ایک نامحرم کو نامحرم سے اس قسم کی خط وکتابت کرنا شرعاً درست نہیں۔ قرآن میں آواز کے متعلق جس احتیاط کی تاکید فرمائی گئی ہے تحریر میں بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنے اس خط سے پہلے بھی آپ نے ایک خط میں کچھ غیر محتاط جملے لکھے تھے۔ اتفاق سے بھائی صاحب کی نظر اُن پر پڑگئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے میں نے کس طرح ان کے دل میں بدگمانی پیدا نہ ہونے دی۔ مگر سچ ہے، حالات کسی کے قابو میں نہیں ہوتے۔ آپ تو خلوص کے تحت میری عیادت کو اسپتال تشریف لے گئیں۔ وہاں کئی بار بھائی صاحب کی نظر آپ پر پڑگئی۔ ان کا پرانا خیال تازہ ہوگیا۔ اب آپ کا یہ نوازش نامہ صادر ہوا۔ مجھے تو آپ کے اس خلوص نے مارا۔ آپ کے اس خلوص کی وجہ سے مجھے سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ بھائی صاحب نے آپ کا یہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیا اور پھر مجھے کس طرح مخاطب فرمایا؟ میں آپ کو کس طرح بتاؤں۔ غیرت کے مارے اس وقت میری کیا حالت ہوئی جب انہوں نے آپ کا لفافہ مجھے عنایت فرمایا اور آپ پر تبصرہ شروع کردیا۔ آپ کی عنایت اور نظر التفات کی وجہ سے

بھائی صاحب کے تبصرے کی زد میں میں بھی آ گیا۔ وہ وقت میرے لیے بڑا کٹھن تھا۔ اللہ اکبر! بھائی صاحب کی دوررسی اور عاقبت اندیشی! آپ کا خط پڑھے بغیر انہوں نے خط کے مضمون کے متعلق جو خیال ظاہر فرمایا وہ سوفی صدی صحیح نکلا۔ بہن! جائز صورت میں میرا اور آپ کا وہ رشتہ تو نہیں جس کا اشارہ آپ کے اس خط کے سب سے آخری فقرے ''آپ کی مخفی'' میں پایا جاتا ہے۔ بھائی صاحب نے بالکل سچ فرمایا تھا کہ مسرور! اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ تم نہیں بتا سکتے'' واقعی میں نہیں بتا سکتا۔ افسوس مرد ہوکر میری یہ ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن عورت ہوکر آپ نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ آپ نے یہ کیا غضب ڈھایا؟

میں آپ کو بتاؤں! آپ کا یہ خط آنے کے بعد کیا ہوا؟ بھائی صاحب کو اب میری شادی کی بے حد جلدی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسی مہینے کے اندر کسی ''بنتِ حوّا'' کو مجھ پر مسلّط کر دیں۔ انہوں نے میرے لیے اپنے ایک قریب ترین دوست کی صاحبزادی صبیحہ کو منتخب کیا ہے۔ میرے سامنے انہوں نے صبیحہ کی بڑی تعریف کی۔ سید صاحب قبلہ کے ذریعے پیغام بھی گیا اور صبیحہ کے والد صاحب نے منظور بھی کر لیا۔

یہ سب کچھ مجھے آگاہ کر کے کیا گیا اور میں دم نہ مار سکا۔ لیکن مجھے ایک اجنبی لڑکی سے کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ میں صبیحہ کے مزاج سے واقف نہیں، اس کے رکھ رکھاؤ سے واقف نہیں، اس کی دل چسپیوں سے واقف نہیں۔ مجھے بس یہ معلوم ہے کہ صبیحہ آپ کی طرح ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور اسے میری بیوی بننا ہے۔ یہ باتیں میں صاف صاف اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ میری طرف سے مایوس ہو جائیں۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر آپ میری رفیقہ حیات بنتیں تو میرے سامنے خواتین میں تبلیغ کا ایک پروگرام ہے۔ اس میں آپ کا ''بے تکلف تعاون'' بہت مفید ہو سکتا تھا۔ ایک عرصے تک میری آپ کی مراسلت نے آپ کو میرے ذہن و مزاج سے قریب کر دیا تھا۔ اب آپ بھی اسی طرح سوچنے لگیں جس طرح میں سوچتا ہوں۔ بڑا اچھا ہوتا وہ، جو آپ کے اس خط سے واضح ہوتا ہے لیکن اب اس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ سب کھیل آپ نے اپنے جذبات کے رَو میں خود بگاڑا ـــــ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کو جو کچھ منظور تھا وہ ہوا۔ ہمیں

خدا کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا جو کچھ کرتا ہے وہ بہتر کرتا ہے۔ ایک مومن کی شانِ عبدیت یہی ہے۔

بھائی صاحب کا علم، ان کا تجربہ، ان کی محبت وشفقت اور ان کی ساری باتوں سے میں اس درجہ مرعوب ہوں کہ مجھ میں نافرمانی وسرتابی کی جسارت نہیں۔ میں اپنے حق میں وہی بہتر سمجھتا ہوں جو بھائی صاحب میرے لیے طے فرمادیں۔ میری زندگی میں کئی ایسے موڑ آئے کہ میں اگر اس وقت اپنی مرضی اور رائے پر قائم رہتا اور بھائی صاحب کے حکم کی تعمیل نہ کرتا، تو میرے لیے تباہی ہی تباہی تھی۔ آپ کا خط کچھ ایسے ڈرامائی انداز میں مجھے ملا کہ میں بروقت پڑھنا تو درکنار، اسے ہاتھ میں لے کر کھول بھی نہ سکا اور وہ کچھ ہوگیا جس سے آپ کو یقیناً صدمہ ہوسکتا ہے۔

آپ نے اپنے خط میں جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے ان سے میرا دل بے حد متاثر ہوا۔ میں آپ کی محبت کا شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ کو میری یہ کمزوری تو معلوم ہی ہوگئی کہ میرے دل ودماغ پر میرے بھائی صاحب کا قبضہ ہے۔ میں ان کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ انہوں نے جس صبیحہ کو میرے لیے منتخب فرمایا گو اس کے مقابلے میں مجھے آپ سے دل چسپی ہے لیکن اب وہ جلد ہی میری بیوی بننے والی ہے۔ اسلامی احکام کی رو سے میرا فرض ہے کہ طوعاً وکرہاً اسی میں دل چسپی لوں۔ اس کے سارے حقوق ادا کروں اور آپ سے گزارش کروں کہ خدا کے واسطے آپ مجھے بھول جائیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ میں آزمائش میں مبتلا ہوجاؤں اور صبیحہ کے متعلق مجھ پر شرعاً جو پابندیاں عائد ہوں گی، ان سے عہدہ برآنہ ہوسکوں۔ والسّلام

اس خط کا جواب تیسرے دن مسرور کو مل گیا۔ جواب پاکر وہ حیران رہ گیا۔ القاب، آداب، مقام، تاریخ اور لکھنے والے کے نام کے بغیر چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

''بھائی صاحب قبلہ کی فہم وفراست پر بے ساختہ میری زبان سے سُبْحَانَ اللّٰہِ نکل گیا۔ انہوں نے آپ کے لیے صبیحہ کا انتخاب خوب کیا میں صبیحہ سے بخوبی واقف ہوں، شکل وصورت میں چشم بد دور، ایسی جیسے حور، اور سیرت میں ایسی کہ دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں۔ فکرونظر میں آپ سے قریب، ذہن ومزاج میں آپ کے مطابق، خواتین

کو دین سے قریب لانے کے لیے آپ کی طرح بے قرار ــــــ ماہنامہ 'حجاب' میں آپ نے صبیحہ کا مضمون ''اردو ادب پر اسلام کا اثر'' ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے املا کرادیا۔ جب میں نے سنا کہ صبیحہ کے لیے آپ کا پیغام آیا ہے تو میرا دل پکار اٹھا۔ ''حق بحقدار رسید''

والسّلام

یہ مختصر خط پڑھ کر مخفی کی وسعتِ قلب اور بلند خیالی سے مسرور مرعوب ہوگیا، وہ ہاتھ مل کر رہ گیا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ آکر نکل گئی۔ صبیحہ لاکھ سب کچھ سہی لیکن مخفی نہیں ہوسکتی۔ مخفی نے اپنے کردار کو بہت جلد انتہائی اونچائی پر پہنچادیا۔ کس انتہائی خلوص اور فکرو نظر کی پاکیزگی کے ساتھ مجھے صبیحہ کی طرف سے اطمینان دلا رہی ہے۔ اللہ اکبر! کس قدر راضی برضا ہے۔ ایک مومن کی حیثیت سے وہ مجھ پر سبقت لے گئی۔ مجھے بھی خدا کی مرضی پر خلوص قلب کے ساتھ راضی اور خوش رہنا چاہیے۔ مسرور نے خط پھر پڑھا اور پھر پڑھا اور یہ کہتے ہوئے جیب میں رکھ لیا۔ ''خدایا! مخفی کے فتنے سے بچالے۔''

اس کے بعد مسرور بے انتہا سنجیدہ رہنے لگا۔ گھر میں شادی کی دھوم تھی۔ اعزّا واقرباء آرہے تھے۔ مہمان ہنس بول رہے تھے۔ گھر قہقہوں سے گونج رہا تھا لیکن ایک نوجوان تھا جو سب سے الگ تھلگ، کھویا کھویا سا رہتا۔ گھر کی چہل پہل سے اسے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوسکی۔ لوگ اس کی اس سنجیدگی کو شرم وحیا تصوّر کر رہے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی۔ اسی حال میں جمعہ آگیا جس کا سب کو انتظار تھا۔ مسرور سب کے ساتھ گیا۔ دلہن کو بیاہ کر گھر لایا۔ پھر جب بعد عشاء وہ دلہن کی ملاقات کو گیا تو اس وقت مخفی اس کے دل ودماغ پر بُری طرح آمسلط ہوئی جیسے

وہ کوشش کر رہا تھا بھولنے کی
مگر وہ یاد آئی جارہی تھی

مسرور نے لاحول پڑھی، اَستغفراللہ پڑھی، معاذ اللہ، اعوذ باللہ اور اس قسم کے جتنے فقرے اسے یاد تھے سبھی تو پڑھ ڈالے۔ لیکن مخفی کو بھی ضد ہوگئی تھی وہ اس کے دل و

دماغ سے نہ نکلنا تھی نہ نکلی۔ مسرور حیران و پریشان مسہری کے برابر پڑی ہوئی آرام کرسی پر جا کر گر گیا۔ خیالات کے ہجوم سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ کسی سخت کش مکش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "اس میں صبیحہ کا کیا قصور ــــــ؟ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے عروس کا گھونگھٹ الٹ دیا اور پھر اس کی زبان سے نکلا ــــــ "آپ" ....اور پھر؟

وہ اللہ کے فضل و کرم پر حیران و ششدر رہ گیا۔